روشنی کی خواہش میں

کنیز نبوی

کنیز نبوی

روشنی کی خواہش

محبت کے اولین جذبے نے صرف ہواؤں کو ہم سفر ہی نہیں بنایا۔ بلکہ حیرتوں کے در بھی کھول دیے۔ دل کے دروازے محبت کے کھل جا سم سم کے طلسم پر صرف وا ہی نہیں ہوئے بلکہ خوشیوں کے پھول بھی بچھا دیے۔

زندگی میں پہلی بار اک نئی سحر طلوع ہوئی جس میں سب سے نمایاں سب سے منفرد مجھے گوہر علی تمیمی کی ذات لگی۔ گوہر میری زندگی کا گوہر مقصود بن گیا' اور میں نے اس کی ذات سے اپنی ساری خوشیاں' اپنے سارے جذبے وابستہ کر دیے۔ سندھ یونیورسٹی کی فضاؤں میں زیرِ لب سرگوشیاں گونجنے لگیں جن میں ہمارا نام ساتھ لیا جانے لگا۔

لوگوں کے نزدیک یہ ایک ایسا وقتی جذبہ تھا' جو کہ اکثر یونیورسٹی کے دور میں شروع ہو کر وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود ختم ہو جاتا ہے' مگر میں جانتی تھی یہ جذبہ سطحی نہیں تھا' میں نے اس کو پوری شدتوں سے چاہا تھا اور اس نے بھی پورے دل سے میری تمنا کی تھی۔ مجھے اس کے وعدوں اور باتوں پر بھرپور اعتماد تھا۔

ہمارے دن سندھ یونیورسٹی میں اور شامیں المنظر پر گزرنے لگیں۔

کبھی کشتی میں سیر کے دوران ڈھیروں باتیں ہوتیں' کبھی کنارے بیٹھے بھٹے کھاتے رہتے' تو کبھی جام شورو کے پل پر کھڑے ہو کر دور۔ روشنیوں کے ٹمٹماتے دیوں کو دیکھ کر اپنے دل میں محبت کے دیے جلاتے۔ سندھیالوجی کی تقریبات ہوں' یا ممتاز مرزا

مکمل ناول

تونیورسٹی میں ہونے والی ادبی کانفرنس ہمارا وہاں پر ساتھ موجود ہونا ضروری ولازم ٹھہرتا۔ کبھی شاہ لطیف کی آفاقی شاعری پر بحث چھڑتی تو کبھی شکار پور کے شیخ ایاز کی شاعری سے دل کے تار چھیڑے جاتے۔

کبھی استاد بخاری کی شاعری میں بولتے درد کا جادو جکڑ لیتا تو کبھی خیرپور میں بسنے والے تنویر عباسی کے الفاظ اس کے لبوں پہ مچلتے تھے۔

ہم ساری دوریاں پھلانگ کر اتنے قریب آچکے تھے کہ اب الگ راستے پر چلنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوگیا تھا' ہماری ذہنی سطح اور فکری سوچ میں کوئی فرق نہ تھا۔ ہم ایک کشتی کے سوار' ایک ہی پتوار اٹھائے ہوئے تھے۔ ہم دونوں کا یقین ایمان کے درجہ پر پہنچ چکا تھا۔ اب الگ ہونا ایمان گنوانے کے مترادف تھا مگر اماں۔ جو حیدر آباد کے گورنمنٹ کالج میں لیکچرر تھیں ۔ جان کر کہ گوہر سردار کا بیٹا ہے اس کی مخالف

" میں

"اماں! وہ بہت اچھا اور نفیس انسان ہے۔" میں نے احتجاج کیا۔

"بیٹا! لگتا ہے مگر ہے نہیں۔" اس سے ملنے کے بعد بھی اماں کے خیالات تبدیل نہ ہوئے تھے۔ اماں نے اسے کھانے پر بلایا تھا۔ وہ کھانا کھا کر جاچکا تھا اور اب رات کے گیارہ بجے ہماری بحث جاری تھی۔

"مومل میری بچی! وہ سردار ہے اور سردار کے لیے محبت اہم ہوتی ہے نہ شادی' وہ صرف سردار ہوتا ہے۔"

"نہیں اماں! وہ بہت کھلے دماغ کا ہے۔" میں نے پورے یقین سے تردید کی تھی۔

"سردار کبھی کھلے دماغ کا نہیں ہوتا۔ وہ کتنا ہی پڑھ لکھ لے اندر سے وہی سردار رہے گا۔" اماں کی آواز میں ماضی کا کرب تھا۔ وہ شہر محبت کی ایسی باسی تھی جس نے دھوکے کو محبت سے جیتتے ہوئے دیکھا تھا اور اس دن سے ان کا محبت سے یقین اٹھا تو پھر کبھی واپس نہ مل سکا۔

سردار نصیر خان مہراں دونوں اس کی زلفوں کے اسیر ہوئے تھے' جب مارشل لا کے اندھیروں نے پورے ملک کو لپیٹ میں لیا ہوا تھا نصیر خان اس کے پڑوس میں آکر آباد ہوا۔ شمالی سندھ کے ایک جاگیردار خاندان کا چشم و چراغ' ساری مردانہ خوب صورتیوں اور سردارانہ بدصورتیوں سے مزین نصیر خان مہر کے آگے چند ملاقاتوں میں ہی وہ اپنا دل ہار گئی اور اس کی دوسری بیوی بن کر یہ سمجھ بیٹھی کہ یہ مالی جسمانی اور روحانی آسودگی ہمیشہ ساتھ رہے گی مگر تقدیر کوئی اور ہی کھیل کھیل رہی تھی۔

جب ہم اپنے تئیں جیت کے نشے میں سرشار ہوتے ہیں تو تقدیر کے وار سے غافل ہوجاتے ہیں۔

نصیر خان نے ہر طرح اس کا خیال رکھا۔ ہر خوشی دی۔ جب مومل پیدا ہوئی تو اس دن اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی' اس وقت نصیر خان کی چپ اسے بہت کھلی۔

"ہماری محبت کی نشانی دنیا میں آنے سے آپ کو خوشی نہیں ہوئی؟" اس نے بڑے مان سے شکوہ کیا۔

"سردار کے گھر بیٹی اگر خاندانی بیوی کی کوکھ سے جنم لے تو بھی خوش بختی کی علامت نہیں سمجھی جاتی۔ تم تو غیر خاندان کی عورت ہو۔"

اس کے تعلیم یافتہ وجود سے سردار باہر نکل آیا تھا۔

وہ چکرا کر رہ گئی۔

"کیا کہہ رہے ہو نصیر خان! بیٹی تو اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔"

"سردار کے گھر اس سے بڑی زحمت کوئی نہیں۔" اس کا دل سرد الفاظ کی مٹھی میں جکڑ گیا۔

"نصیر خان! اولاد پیدا کرنے اور بیٹی یا بیٹے کے انتخاب کا اختیار اللہ نے انسان کو نہیں دیا۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"بیٹیاں ہمیں کمزور کرتی ہیں اور بیٹے مضبوط۔ بھاگوان ہوتی ہیں وہ عورتیں جو بیٹوں کو جنم دیتی ہیں۔"

مہر نصیر اسے منحوس کہہ رہا تھا' وہ چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گئی پھر ہوش سے بولی۔

"میں تو صرف کھیتی ہوں نصیر خان کھیتی! اس میں جو بویا جاتا ہے' وہی کاٹا جاتا ہے۔ فصل خراب نکلے تو اس میں بونے والے کا قصور ہوتا ہے' دھرتی کا نہیں۔" وہ پورے قد کے ساتھ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

وہ سردار تھا اور پورے قد کی عورتیں اسے پسند نہیں تھیں۔

"تم پڑھی لکھی عورتیں انتہائی بدتمیز اور خود سر ہوتی ہو۔ اپنے نام نہاد علم کے گھمنڈ کا شکار' ہر بات میں بحث کرنے کی عادی' صحیح نہ ہوتے ہوئے بھی خود کو صحیح ثابت کرنے پر مصر۔ مگر تمہاری حیثیت کیا ہے۔ ہر قدم پر مرد کی محتاج اور مرد کا سہارا لینے والی خالی برتنوں کی طرح ہو' جو صرف بجتے ہیں۔"

شادی کے دو سال بعد ہی نصیر خان مہر کی محبت کا جادو اتر گیا تھا۔ ان کے درمیان تلخی کی جو دیوار کھڑی ہوئی تھی ان دونوں میں سے کوئی اس دیوار کو نہ پار کرسکا۔

وہ شہری بیوی شہر میں تنہا رہ گئی اور وہ گاؤں کا وڈیرا اپنے چار بیٹوں کی ماں خاندانی بیوی کے پاس چلا گیا۔

اس کے دل میں نصیر خان کے لیے وہ پہلے والی محبت وعزت نہ رہی اور نصیر خان کے لیے بھی وہ پرانی اہمیت کھو چکی تھی۔ ان دیکھی سرد مہری کی لہر نے ان دونوں کو لپیٹ میں لے لیا۔ جیسے تیسے چند سال کے بھدے ٹانکے زندگی کے جھولے میں لگے۔ مومل پانچ سال کی ہوئی تو اس نے تعلق کی ساری سلائی ادھیڑ کر زندگی کے اس جھولے کو لیرو لیر کردیا۔

"میں مجبور ہوں۔ مجھے اپنی بیٹی بیاہنی ہے۔ تم جانتی ہو' ہمارے ادلے بدلے کے رشتے ہیں' اور میرے کزن نے یہ شرط رکھی ہے کہ جب تک میں اس کی بہن کے سر سے سوکن کا سایہ نہیں ہٹاؤں گا' وہ میری بہن سے شادی نہیں کرے گا۔"

وہ دکھ کی شدت سے کچھ بول ہی نہ سکی۔ سکتے کی کیفیت میں آگئی۔

"میں مانتا ہوں کہ میں نے تم سے وعدے کیے تھے عمر بھر اکٹھے رہنے' ساتھ نبھانے کے' اور سردار اپنے وعدے سے پھرتے بھی نہیں۔ لیکن یہاں تو سوال ہی سرداری کا ہے۔ تمہیں طلاق نہ دینے کی صورت میں مجھ سے جائیداد' سرداری اور موروثی الیکشن کی سیٹ چھن جائے گی۔ وہ میرے دوسرے بھائی کو دے دی جائے گی۔ اس لیے میں تمہیں طلاق دینے پر مجبور ہوگیا ہوں۔" جلاد لفظوں نے اس کا جیسے گلا گھونٹ دیا۔

"مومل میری بیٹی ہے۔ اسے میرے حوالے کردو۔ حویلی میں اس کی تربیت بہتر طور پر ہوسکے گی۔"

"خدا کے لیے میرے جینے کا کوئی ایک راستہ تو چھوڑ دو۔ مومل میری زندگی ہے۔ مجھ سے زندگی تو نہ چھینو۔" اس نے جینے کے لیے آخری بار ہاتھ پاؤں مارے۔ وہ پھانسی گھاٹ پر لٹکی تھی۔

"میں تم سے اس زندگی کی بھیک مانگتی ہوں' اس محبت کے صدقے جس نے ہماری زندگی کے کچھ سالوں کو خوب صورت بنایا۔ تمہیں ان خوابوں کا واسطہ جن کی تعبیروں نے وقتی طور پر ہی سہی مگر خوشی کے رنگ ضرور بھرے تھے۔" اس نے درد بھری التجا کی مگر وہ منصف نہیں تھا کہ زندگی کی آخری خواہش پوری کردیتا۔

"یہ فیصلہ تب ہوگا' جب تمہیں طلاق کے کاغذات ملیں گے۔ اس وقت میں جلدی میں ہوں۔"

اس نے موقع غنیمت جانا اور مومل کو لے کر کراچی سے حیدر آباد اپنی دوست کے ہاں چلی گئی۔ اسے پتا تھا کہ سردار نصیر خان کبھی بھی مومل کو اس کے پاس نہیں چھوڑے گا اور لڑنے کی طاقت اس میں تھی نہیں سو روپوشی کو ہی بہتر سمجھا۔

دو سال تک اس نے اپنی دوست نسیم کے گھر سے قدم بھی باہر نہ نکالا۔ میکے کی طرف سے صرف ایک بھائی ہی تھا' جو باہر ہوتا تھا۔ سو وہ کسی بھی پریشانی سے محفوظ رہی' مگر کب تک زندگی دوسروں کے سہارے گزارتی۔ گوکہ نسیم اور اس کے گھر والوں نے اس کا بے حد خیال رکھا تھا۔ مگر وہ اب ان پر مزید بوجھ نہیں بننا چاہتی تھی' سو نسیم کے باپ کی کوششوں سے اسے

اسکول میں ملازمت مل گئی۔ زندگی اپنی ڈگر پر چل پڑی۔

نصیر خان سے پھر زندگی بھر ملاقات نہ ہوئی۔ شاید وہ اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک ہار کر بیٹھ گیا تھا۔

اور آج پھر موحل ایک سردار کے دام الفت کی اسیر ہو کر اسی راستے پر قدم رکھ رہی تھی۔

ماضی کے سارے سلے ہوئے زخم ایک ایک کر کے ادھڑنے لگے۔ یادوں کی کھڑکیوں سے محبت کے سارے لمحے قطرہ قطرہ دل پر ٹپکنے لگے۔

ذہن کے مدفن سے سوچیں نکل کر دل ناصبور کے ناسور کو تازہ کر گئیں۔ روح کے اندر کرب کی چنگاریاں اڑنے لگیں۔

محبت کیسا مجبور کرنے والا جذبہ ہے۔ اس جذبے نے سب کچھ چھین کر تہی دامن کر دیا۔ قرب کے خواب کرب بن کر ساری عمر پر محیط ہو گئے۔ جانتی تھی یہ جذبہ کسی بند سے نہیں تھمتا۔ مگر پھر بھی ماں تھی بیٹی کو کرب ناک سفر سے بچانے کی سعی تو کرنا ہی تھی۔

ماں بیٹی کے بیچ خاموش ضد کئی دنوں تک چپ کی چھایا میں چلتی رہی۔ مگر کب تک۔

"اماں! پلیز راضی ہو جائیں۔ گوہر کو بہت جلدی ہے۔ وہ کہتا ہے' اب زیادہ انتظار نہیں کر سکتا۔" موحل سراپا التجا بن کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"موحل! میری بچی! یہ راستہ کانٹوں بھرا ہے۔ تیرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔"

"اماں! خدا کے لیے سارے وہم و شکوک نکال پھینکیں' ضروری نہیں کہ جو آپ کے ساتھ ہوا ہو' وہ میرے ساتھ بھی ہو۔"

"موحل! میں اپنا دکھ سہ گئی مگر تیرا دکھ مجھے مار ڈالے گا۔"

"اماں! گوہر کے بغیر میرے لیے زندگی صرف دکھ ہی ہو گی۔"

"تیری رگوں میں ایک سردار کا ہی خون دوڑ رہا ہے۔ تو بھی اپنی ضد کی پکی ہے۔ مگر میں چاہتی تھی کہ میرے تجربے سے سیکھ لے' مگر تو خود تجربے سے گزرنا چاہتی ہے تو تیری مرضی۔ میں تجھے نصیب سے تو لڑا نہیں سکتی۔"

"اماں! پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ سارے سردار ایک جیسے نہیں ہوتے۔" اس نے ولاسا دیا۔

"حوالہ اٹھاتے ہوئے ساری انگلیاں برابر ہو جاتی ہیں۔ سردار سارے برابر ہوتے ہیں' ایک ہی جبلت' ایک ہی فطرت رکھنے والے۔"

گئے دنوں کا نوحہ اس کے لہجے سے مترشح تھا۔ جبکہ وہ محبت کی سرشاری سے مسکرائی۔ ماں کے گلے میں بانہیں ڈال کے پریقین لہجے میں گویا ہوئی۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ کچھ نہیں ہو گا۔ سارے وسوسے' واہمے دل سے نکال پھینکیے۔"

اور نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بیٹی کی خوشیوں کے لیے ہتھیار ڈالنا پڑے۔ مگر ہمہ وقت دعا اس کے لبوں پر مچلتی رہتی۔

"یا اللہ میری بیٹی کا نصیب اچھا بنا دے۔"

موحل مہر رخصت ہو کر گوہر شمسی کے کوٹھے پہنچی' جہاں وسیع و عریض حویلی میں ان کی شادی کی تقریب دھوم دھام سے منائی گئی۔ وہ نازاں تھی گوہر کو پانے پر اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا گوہر علی شمسی کی محبت کا کہ وہ اس کی پہلی بیوی بنی تھی۔

اور حویلی میں اس شادی کی تقریب میں کوٹھ راج والوں نے ہی نہیں دوست احباب نے بھی بھرپور شرکت کی۔ وہ محبت کے لمحوں میں سرشار کتنے ہی دن اپنے اردگرد کے ماحول سے بے خبر رہی۔ شہر آکر گوہر کے ساتھ رہتی تو گھومنا پھرنا' بوٹنگ کرنا' شاپنگ کرنا' کہیں جاتی تو کبھی فارم ہاؤس چلی جاتی' کبھی گوہر کی بنائی ہوئی مصنوعی جھیل میں مچھلی کا شکار کرتی۔ گوہر کی سنگت نے اسے حسین تر بنا دیا۔ پہلے سال کا تو اسے پتا ہی نہ چلا کیسے گزر گیا۔ ایک بار پریگننٹ ہوئی مگر بے احتیاطی میں ضائع ہو گیا' وہ خود تو زیادہ رنجیدہ نہیں ہوئی' مگر گوہر کی ماں نے کچھ زیادہ ہی سوگ منایا۔

"آپ کو دکھ نہیں ہوا۔" اس نے سرہانے بیٹھے گوہر سے استفسار کیا۔

"نہیں ہم بوڑھے تھوڑا ہی ہو گئے ہیں۔ زندگی پڑی ہے بچے پیدا کرنے اور پالنے کے لیے۔" اس کی مسکراہٹ نے ہمت و محبت میں کئی گنا اضافہ کیا۔

✡ ✡ ✡

وہ چند روز کے لیے اسلام آباد گیا تھا' اور وہ اس کی غیر موجودگی میں بور ہو رہی تھی۔ اسی بوریت نے اسے کمرے کے مصنوعی ماحول سے نکال کر قدرتی ماحول میں لا کھڑا کیا۔

صحن کی وسعت نے درختوں کی لمبی قطار کو گود میں لے رکھا تھا۔ وہ ہر درخت کی سرگوشی سنتی آگے بڑھتی رہی۔ سرسبز درختوں کے بیچ پھولوں کے مختلف پودوں نے ماحول کو مہکا رکھا تھا۔ محبت بھی کیا خوشبو کی طرح ذات سے لپٹ کر وجود کا حصہ بن جاتی ہے۔ جسے ہم چھو نہیں سکتے' پکڑ نہیں سکتے ہیں' محسوس کر سکتے ہیں۔ وہ روح کی طرح زندہ رکھتی ہے۔ مگر دکھتی نہیں' مگر نہ دکھنے کے باوجود زندگی کا احساس اور اپنے ہونے کی پہچان ہوتی ہے۔

پھولوں کے جھرمٹ نے سوچ کے در وا کیے۔ مسکراہٹ نے لبوں کو نرمی سے چھوا۔

"گوہر! تم میرے پاس نہ ہو کر بھی میرے پاس ہو' کتنا طاقتور احساس محبت ہے۔ یہ محبت کا احسان ہے کہ وہ ہمارے دلوں پر راج کرتی ہے۔"

فوراً" دل نے چاہا یہ احساس اسے لکھ بھیجے اور گرد نظر دوڑائی کہ کوئی ملازمہ ہو تو اس سے کہے کمرے سے فون لا دے۔

اس کی نظر اس نو عمر لڑکی پر پڑی جو حویلی میں یقیناً" نووارد تھی۔ اس سے پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔

گول چہرے پر بھنورا سی سیاہ آنکھیں سجائے' پلکوں کی لمبی باڑھ جھکائے' رلی گھٹنوں پر رکھ کر کڑھائی کے کام میں منہمک تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" وہ عین سر کے اوپر کھڑی ہو کر پوچھنے لگی۔

اس نے چونک کر سر اٹھایا' سوئی انگلی میں چبھ گئی۔

"میل!" گلاب جیسے لب آہستہ سے وا ہوئے۔ اس کے ڈرے ڈرے انداز پر موحل مسکرا دی۔ وہ بلاشبہ اتنی خوب صورت تھی' حسن پر نظر غیر ارادی اٹھ جائے تو واپس نہ آئے۔

"تمہیں پتا ہے تم کتنی سوہنی ہو۔"

وہ اس تعریف پر شرمائی تو خون کی لالی شام کی شفق کی طرح اس کے رخساروں پر سمٹ آئی۔ اس نے بہت دلچسپی سے اس دلکش منظر کو دیکھا۔

"آج سے پہلے تمہیں حویلی میں نہیں دیکھا' ابھی آئی ہو؟"

"جی دو دن ہوئے ہیں۔" وہ زور سے سر ہلا کے بولی۔ اس کے اس بے ساختہ انداز پہ وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ "اکیلی آئی ہو؟"

"جی میرا پیو (باپ) چھوڑ گیا ہے۔"

"موحل کنوارا! (دلہن) بڑے سردار اور چھوٹے سردار اسلام آباد سے آئیں گے تو اس کا نکاح پڑھوا کر سنگ چٹی (رشتہ خون بہا) میں دیں گے۔" اس کی ملازمہ نے اس کو میل سے بات کرتے دیکھا تو آکر بتایا۔

"کیا مطلب سنگ چٹی کا؟" وہ درحقیقت دھچکا لگا۔

"موحل کنوارا! میل کے باپ نے پانی کی باری پر لال اللہ تیتانی کے بیٹے کو قتل کر دیا تھا' پھر جرگہ ہوا' اور اس میں خون بخشی کے عوض بیٹی کا رشتہ دے کر اپنی اور اپنے بیٹے کی گردن چھڑا لی۔ اگر وہ سنگ چٹی (رشتے کا جرمانہ) نہ بھرتا تو بدلے میں بیٹے کو حوالے کرنا پڑتا یا قتل ہونے کے لیے۔ لال اللہ تیتانی نے یہی شرط رکھی تھی۔"

"کیا عمر ہو گی اس لڑکے کی؟" اس نے مسلسل میل کو مرکز نگاہ رکھ کر پوچھا۔

"موحل کنوار! وہ لڑکا تھوڑا ہی ہے' وہ تو بڈھا کھوسٹ ہے۔ ساٹھ ستر کا تو ہو گا۔ دو شادیاں کی تھیں'

جس سے سات بیٹیاں چھ بیٹے ہیں۔ ایک بیٹے کا قتل ہو گیا۔ باقیوں کی بھی وہ دو شادیاں ہیں۔"

اس کا سر چکرا گیا۔ بے چینی سے پلک جھپکتی اس نوخیز حسینہ پر اس کو بے تحاشا رحم آیا۔ خوف کی پیلاہٹ نے چہرے کی گلابیوں کو دھکیل کر اپنے لیے رستہ بنایا تھا۔

"مومل کنوار! وہ موگا مرھلا (مرا ہوا بڈھا) تو اسے نوچ کھائے گا' پورا اور بے درندہ۔" اس کے دل میں درد کی ایک لمبی ٹیس اٹھی۔

"بس کنوار! اللہ ایسے نصیب سے سب کی نیانیوں (بیٹیوں) کو بچائے۔" اس کی ملازمہ اس کی اور مومل کی دلی کیفیت سے بے خبر تبصرے کیے جا رہی تھی۔

"تم... فکر نہ کرو۔ میں گوہر سے بات کروں گی۔" اس نے ایک ٹوٹا ہوا دلاسا روایتوں کی چکی میں پستی اس معصوم لڑکی کے چھید چھید پلو سے باندھنے کی کوشش کی۔

"ادا! کچھ نہیں ہو سکتا اب تو فیصلہ ہو گیا' تب ہی تو اس کا باپ اسے حویلی میں چھوڑ گیا ہے۔ بڑے سردار اپنے فیصلے نہیں بدلتے۔" ملازمہ نے وہ دلاسا بھی اس کے پلو سے نکال پھینکا۔

اور مومل کے اندر رامز جلیل کی ساری کہانیوں کی تلخی جاگ اٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

سرداری سنگت میں سانس لینے والی مومل نے بے حسی کے پیراہن کو تار تار کر دیا۔ ذاتی خوشیوں کے خمار سے نکل کر ارد گرد نگاہ ڈالی تو معاشرے کے اندر عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر تڑپ کر رہ گئی۔ پڑھی لکھی اعلا خیالات والی مومل اس کے اندر سے نکل آئی۔

پتا نہیں اس نے خود کو دریافت کیا تھا یا وہ خود بخود دریافت ہو گئی۔ اس کی یادداشت میں محنتی استاد مال کے حق و سچ کے سبق تازہ ہو گئے۔ ضمیر کی عدالت نے بہانگ دہل سنانے کا حکم صادر فرما دیا۔

"عورت ایک جیتا جاگتا' سانس لیتا ہوا وجود ہے۔ وہ وجود نہ ہو تو مرد کا وجود ہی ختم ہو جاتا ہے گوہر!"

"ہاں بھئی اس سے کب انکار ہے مجھے۔" اسلام آباد واپسی پر اس کا موڈ خوش گوار تھا۔

"عورت بے جان ملکیت نہیں کہ ستک چٹی میں دی جائے۔" وہ سراپا سوال بن کر اس کے سامنے آ کھڑی تھی۔

"دیکھو جانم! بعض اوقات ہمیں نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے فیصلے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ہماری روایات ہیں۔"

"پھر ہماری تعلیم اور ہمارے شعور کا کیا فائدہ جو ہم ایسی گھٹیا روایات کی پاس داری کرتے رہیں۔"

"ہم مجبور ہیں' صدیوں سے رائج جرگہ قوانین نہیں بدل سکتے۔"

"جن کے ہاتھوں میں فیصلوں کا اختیار ہو' وہ مجبور نہیں ہوتے نہ ہی بے اختیار۔ میں جانتی ہوں تم بااختیار ہو اور فیصلہ بدلنے کی طاقت بھی رکھتے ہو اگر چاہو تو۔"

"یہ روایات' فیصلے' جرگے' یہ تمہارا مسئلہ نہیں مومل! تم کہاں پڑ رہی ہو ان فضول باتوں میں۔ کیا ہو گیا ہے' خواہ مخواہ بحث کیے جا رہی ہو۔ میں اتنی شاپنگ کر کے آیا ہوں تمہارے لیے بجائے وہ دیکھنے کے' بے کار باتیں لیے بیٹھی ہو۔" وہ جھنجلا اٹھا۔

"اچھا اچھا' غصہ کرنے کی ضرورت نہیں' مگر ایک بات ہے میں میل کو اس بڈھے کے حوالے کرنے کی اجازت نہیں دوں گی۔" بڑے مان سے کہہ کر وہ سامان نکالنے لگی۔

"یہ تو بڑا خوب صورت سیٹ ہے۔" جیولری بکس کھولتے ہی ڈائمنڈ کے لاکٹ سیٹ نے اسے خوش کر دیا۔

"تم پہنو گی تو اور خوب صورت لگے گا۔" گوہر ہنستے ہوئے اسے پہنانے لگا۔

"تم یہ فیصلہ رکوا نہیں سکتے؟" مضمحل انداز میں پوچھا۔

"نہیں!" لاکٹ پہنتے ہوئے اتنی ہی سختی سے جواب آیا۔ جو جاگیرداروں کے رویے اور عمل میں ہمیشہ سے موجود رہی ہے۔

اس نے نڈھال ہو کر آنکھیں موند لیں۔

"کتنی بے بس ہوں میں۔ بہت مان تھا مجھے گوہر کی محبت پر۔ کیا پتا تھا اندر سے اتنا سخت ہے۔ خواہ مخواہ میل کو دلاسے دیے۔" اس نے نڈھالی۔

کتنی ہی دیر گزر گئی سوچ سوچ کر اس کا ذہن تھک گیا تو اٹھ کر کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

نیچے میل سرخ جوڑے میں ملازمہ کی سنگت میں باہر جاتی نظر آئی۔

آنسوؤں کے سارے پنچھی اس کی آنکھوں سے اڑان بھر رہے تھے۔ میل کی اداس نظروں میں ان کہا گلہ اس کو بھی ایک سردار کی بیوی ثابت کر رہا تھا۔ ان دیکھا بوجھ آ پڑا۔ وہ ہل بھی نہ سکی۔ پتھر کی ہو گئی۔

اور میل آنسو بہائے خوف سے سیاہ پڑتے وجود کے ساتھ رخصت ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

حوا نے جب آدم کی پسلی سے جنم لیا تو وہ اس کی زوج بنی' وہ جوڑا بن کر نسل انسانی کی افزائش کے شرف سے بار یاب ہوئی' بڑے عرصے تک وہ آدم کے برابر رہی' اس کے دکھوں سکھوں کی بیلی اس کی محنت مشقت کی ساتھی۔

جنت و زمین کے اولین جوڑے نے برابری محبت و عزت کی بنیاد پر ہی اسی بنیاد پر زندگی کا آغاز کیا۔

ان کی طرز زندگی میں نہ کوئی برتر تھا نہ کمتر' وہ اللہ کے حکم کے مطابق صرف ایک ایسا اشرف المخلوقات کا اولین جوڑا تھا۔ جس نے نسل انسانی کی پیدائش اور زمین پر اللہ کی خلافت قائم کرنے کے مقصد کو آگے بڑھایا۔

آہستہ آہستہ اس جوڑے کے ایک فرد نے طاقت پکڑی' قتل کیا' جھگڑا کیا' فساد پھیلایا' جب تک بندہ رہا' تب ماں کی کوکھ سے جنم لینے کا احساس حاوی رہا' جب

خدائی کا دعوے دار بنا تب وہ صرف مرد رہا اور عورت پر برتر' عورت سے بہتر اور حاکم اعلا بن بیٹھا۔

اس گھمنڈ اور تکبر میں جنم دینے والی ماں کو بھی نہیں بخشا گیا' کیا گیا

آدم تو بے گناہ تھا' شجر ممنوعہ کھلانے' ورغلانے والی صرف حوا تھی۔ عورت تو صرف دل بہلانے' خوشیاں حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

راہبوں اور پادریوں نے حوا کے جرم پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ حوا تب سے آج تک کٹہرے میں کھڑی ہے۔

گزرتے وقت نے بوجھ کم کیا تو اک بار پھر میل آ گئی۔ اس کے سارے رنگ اڑ گئے تھے۔ اور وہ پژمردگی کا عنوان بن چکی تھی' اس کی آنکھیں ویران کھنڈر اور جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو چکا تھا۔

"تم... تم خوش تو ہو نا میل؟" کئی بار لبوں پر رکنے والے جملے کو اس نے ڈھیروں ہمت جمع کر کے ادا کیا۔

صدیوں سے جھکا ہوا سر اک لمحے کو اٹھا۔ دکھ کی لہر نظر کی برق بن کر اس کے دل سے چمٹ گئی۔

"میرے پاس آؤ میل۔"

"کام کرتی ہو گھر میں؟"

"جی کمرو میرے ہاتھ سے کچھ کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ صبح اٹھ کر جھاڑو دیتی ہوں' سارے گھر اور باڑے کی' پھر چارہ کاٹتی ہوں مشین پر' روزانہ کپڑے دھوتی ہوں۔ برتن مانجھتی ہوں۔ سو کن کی ٹانگیں دباتی ہوں' پھر یہی کام شام کو بھی کرتی ہوں' سارا دن ایسے ہی گزرتا ہے۔"

وہ کسی روبوٹ کی طرح روز مرہ کی تفصیل بتا گئی۔

اس نے چنو رے قمیص ہٹ دی۔ نیلوں نیل جسم دیکھ کر وہ دکھ کی کیفیت میں گھر گئی۔

"وہ مطلب براری کے بعد جانوروں کی طرح پیٹتا ہے میرا باپ مجھے خود ہی مار کر دفن کر دیتا تو بہتر تھا۔ روز روز تو نہ مرتی۔"

اس کی ہچکیوں میں گندھے ہوئے آنسوؤں نے

اس کے اندر غم و غصہ اور نفرت بھر دی۔
"چل میل! گھر بھی چلنا ہے یا یہیں بیٹھی رہے گی؟"
اس کی سوکن نے اندر داخل ہوتے ہوئے اکھڑ لہجے میں کہا۔
"تم باہر جاؤ' یہ آرہی ہے۔" موول نے رکھائی سے کہا۔
میل نے سرعت سے آنسو پونچھے اور چل دی۔
رات کو کھانے پر بھی وہ بے دلی سے کھا رہی تھی۔
"کیا بات ہے۔ طبیعت ٹھیک ہے؟" بالآخر گوہر نے پوچھ ہی ڈالا۔
"وہ بڈھا اسے مارتا ہے' تم اسے بلا کر منع کیوں نہیں کرتے کہ اسے نہ مارے۔" وہ پھٹ پڑی۔
"کس کی بات کر رہی ہو؟"
"میل کی۔"
"تمہارا دماغ خراب ہوا ہے' اب ہمارے لیے یہی فیصلے رہ گئے ہیں کرنے کو کہ لوگوں کو بلا کر کہیں اپنی عورتوں کو نہ مارا کریں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔
"یہ فیصلہ تم لوگوں نے کیا تھا' اس پر ظلم کے ذمہ دار بھی تم لوگ ہو۔"
"یہ فیصلہ اس کے باپ کے جرم کی وجہ سے ہوا تھا' سمجھیں تم؟ اور وہ اس کا شوہر ہے' مارے یا محبت کرے' یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ دوسروں کے لیے اپنی زندگی عذاب مت بناؤ موول!" اس نے غصے سے چیخ کر کہا۔
"تم مرد ہو نا اس لیے مردوں کا ہی ساتھ دو گے۔ عورت پستی رہے' مرتی رہے اور مردوں کے جرم کے بدلے سزا پاتی رہے۔"
"فضول مت بکو۔ اگر میں تمہیں مارنے لگوں تو کون روک سکتا ہے مجھے۔ وہ بھی اس کی بیوی ہے۔ ملکیت ہے اس کی۔ روندے' کچلے' یا نوچے چھوڑ دے۔ میل کے وارثوں نے بہ رضا و خوشی اس کو تیتالی کے حوالے کیا ہے۔"
"تم سارے مرد بے حس ہوتے ہو۔" وہ روتے ہوئے بولی۔
"تم بھی تو عورت ہونے کے ناتے اس کی طرف داری کر رہی ہو۔"
"وہ مظلوم ہے گوہر!"
"شکر کرو کہ تم نہیں ہو۔"

✿ ✿ ✿

گوہر اپنے باپ کے ساتھ کراچی گیا ہوا تھا۔ وہ ملازمہ کو لے کر باہر نکل آئی۔ وہ گاؤں کے سرکاری اسکول کی عمارت دیکھنا چاہتی تھی۔
"موول کنوار! اگر سردار جی کو پتا چل گیا تو وہ بہت غصہ ہوں گی۔" اس کی ٹانگوں کے ساتھ آواز بھی لرز رہی تھی۔
"اچھا' تم مجھے پتا سمجھاؤ' کس طرف اسکول بنا ہوا ہے' پھر چلی جاؤ حویلی۔" اسے ملازمہ کی حالت پر رحم آگیا۔
"موول کنوار! نہر کے کنارے جہاں آموں کے درخت کا جھنڈ ہے' ان کے پیچھے ہی ہے۔" اس نے اجرک کو اچھی طرح لپیٹ کر خود کو چھپایا۔ منہ ڈھانپ کر نہر کے کنارے چلنے لگی۔
اسکول کی عمارت خستہ حال تھی۔ چار دیواری بھی تھی مگر جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ پلاسٹر اکھڑ چکا تھا۔ رنگ و روغن کی باقیات بھی نہیں بچی تھی۔
ٹوٹی ہوئی کھڑکیوں سے اس نے اندر جھانکا' ایک کمرے میں گندم کی بوریاں' دوسرے میں گھاس پھوس' تیسرے کمرے میں کھاد کی بوریاں' چوتھے کمرے میں جھولا اور چارپائی پر ایک آدمی دھوتی باندھے بے خبر سو رہا تھا۔ پاس ہی پانی کا گھڑا اور کچھ لوہے کے اوزار درانتی وغیرہ رکھے تھے۔
وہ باہر نکل آئی۔ اسکول کے صحن میں کھڑی بھینسیں ڈکارنے لگیں۔ نہر کے کنارے چلتے ہوئے گرمی کی کڑی دھوپ نے اس کو پسینے میں شرابور کر دیا۔
"کیا ایسے کنڈم شدہ کمروں سے نکل کر دھوپ و گرمی سے

پاؤں گی؟" ایک لمحے کو اس نے خود سے سوال کیا۔
"اگر اپنے مقصد کو پانا ہے تو سکھ چین آرام کو تیاگنا لازم ہے۔" اندر سے جواب موصول ہوا۔
گھر میں داخل ہوئی تو اماں جی ابھی تک سو رہی تھیں۔
اس نے شکر کا سانس لیا کہ کسی کو پتا نہ چلا تھا کہ وہ اسکول کی سرکاری عمارت دیکھ آئی تھی۔ جس کو اس کے سسر نے ذاتی گودام بنا رکھا تھا۔
رات تک گوہر کراچی سے آچکا تھا۔

✿ ✿ ✿

"اس گاؤں میں اسکول نہیں ہے؟" دوسرے دن ناشتہ کرتے ہوئے اس نے مکمل انجان بن کر پوچھا۔
گوہر نے ایک نظر اس کو دیکھا پھر نفی میں سر کو جنبش دے کر توجہ ناشتے پر مرکوز کر دی۔
"آپ کے ہوتے ہوئے بھی؟" اچنبھے سے کہا۔
"اسکول تو کافی عرصے پہلے سے بنا ہے۔ مگر کوئی ٹیچر گاؤں میں آتی نہیں' اس لیے پڑھائی کا سلسلہ چل نہیں پایا۔"
"چلو کوئی لیڈی ٹیچر نہیں آتی مگر یہاں بوائز اسکول کا بھی یہی حال ہے' کیا آپ کا فرض نہیں بنتا تھا اپنے گاؤں کے لڑکے اور لڑکیوں کو پڑھانا۔ ان کے لیے خود ذاتی کوشش سے ٹیچر ارینج کرنا۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں چبھتا سوال کیا۔
"یہاں کے لوگ عورت کی پڑھائی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ان کا خیال ہے کہ تعلیم عورت کو خود سر بناتی ہے۔" وہ لاپروائی سے بولا۔
"آپ پڑھے لکھے تھے۔ باشعور تھے۔ اپنے عمل اور طاقت سے یہ سوچ تبدیل کر سکتے تھے۔"
"مگر کیوں؟" اس نے پلیٹ کھسکا کر دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سختی سے کہا۔
"اس لیے کہ علم ہی ہے جو معاشرے کو متحرک رکھتا ہے۔ غربت کی ذلت سے بچاتا ہے' جہالت کی تاریکی اور غلامانہ ذہنیت کو ختم کرتا ہے۔"
اس نے اسی کی طرح مکمل اعتماد سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھردرے لہجے میں کہا۔
"میں نے معاشرے کو سدھارنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا موول مرو!" وہ چبا چبا کر بولا۔ پھر ناشتا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا تھا۔
"پلیز گوہر! اس میں اتنی ناراضی والی کیا بات ہے؟" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے تحمل سے کہا۔
"زہر لگتی ہیں مجھے بحث کرنے والی عورتیں۔" اکتاہٹ اور بے زاری اس کے لہجے سے عیاں تھی۔
"اتنی محبت کے بعد ہم ایک دوسرے پر اتنا بھی حق نہیں رکھتے کہ کھل کر بات کر سکیں۔" اس کی آواز بھرا گئی۔
"دیکھو موول! تم نے جب مجھے قبول کیا تو اس نظام کو بھی دل سے قبول کرو جس کا میں حصہ ہوں۔"
"میں تو صرف بنیادی انسانی حقوق کی بات کرتی ہوں۔ گوہر! آپ کے پاس طاقت ہے' دولت ہے' ہمت ہے' حوصلہ ہے۔ چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ نے مجھے میرے شعور سمیت قبول کیا ہے۔"
"اچھا بس' آنسو پونچھ لو تماشہ مت بناؤ اپنا بھی اور میرا بھی۔" اس نے ملازماؤں کو سر جھکا کر کام کرتے ہوئے دیکھ کر کہا۔
"سب کے کان ادھر ہی لگے ہوں گے۔" کھڑکی سے خشمگیں نظروں سے اماں کو گھورتے دیکھ کر اسے ایک بار پھر غصہ آگیا۔ اس کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس کی ماں نے کبھی سر اٹھا کر اس کے باپ سے بات کی ہو۔ وہ تیز تیز قدم اٹھا کر باہر نکل گیا۔

✿ ✿ ✿

محبت کی حسینہ بہت خوب صورت تھی۔ اس کی دوشیزگی کے عجیب رنگ تھے۔ جلوے پر جلوہ' جھلسا دینے والا' موہ کر اپنا رنگ چڑھا دیتی۔

اس کے وجود میں ٹھنڈک تھی تو تپش بھی۔ وہ آگ اور پانی کا ملاپ، سمندر اور سورج کے وصل کی مانند رکھتی۔ اس کے گرد خوشبوؤں کا ہالہ۔ اور کنک کی جلن رکھتی، دور رگوں کو جھنجوڑتے اور دل کو اپنے گرد محور رقص رکھنے کے گر سے آشنا اور سارے ماحول پر چھا جانے کے ہنر میں ماہر رہی تھی۔

ازل سے لب تک اس کے داؤ پیچ پر خلق خدا حیران و پریشان، افتاں و خیزاں، آنکھ حادمند بھاگتے رہنے پر مجبور کردی گئی۔ وہ کبھی صوفیوں کے سلوک میں چھپتی۔ کبھی دلوں میں پردہ پوش ہوتی۔

حسیناؤں کی آنکھوں میں کاجل کی طرح سجتی، پازیب کی طرح بجتی، جہاں دم لینے کو رکتی ایسا زخم چھوڑتی جس کا مرہم نہ ملتا۔ ایسا غم لگاتی جس کا مداوا نہ ہوتا۔ وہ جہاں قیام کرتی اس زمین دل کو زرخیز بنا دیتی۔ وجود کو ہر بوجھ سے آزاد کر کے ہواؤں کا راہی بنا دیتی۔ سیر کائنات کا سیاح بنا کر بادلوں کے انبار لگا دیتی۔ خوابوں کا ہم سفر بنا کر دشت جنوں سے ذات کو دریافت کراتی، دوران ذات تحیر کا میلہ سجا، ذہن کے دریچے کھلتے، سوچ کا ساگر چھلکا، احساسات کا جہان بنا، موج در موج وجدان وارد ہوتے گوہر کی سنگت پر اسے بڑا مان تھا۔ اور اپنی ذات پر بے تحاشا اعتماد تھا کہ وہ بڑے سردار کے پاس چلی آئی۔

"السلام علیکم بابا جان!"

"وعلیکم السلام۔ کیسی ہو بابا؟ کوئی تکلیف تو نہیں نا یہاں پر۔" سردار بہادر خان مگسی اخبار چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"جی بابا جان! کوئی تکلیف تو نہیں مگر آج میں آپ کو آپ کا وعدہ یاد دلانے آئی ہوں۔" وہ ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"اچھا! بھلا کون سا وعدہ؟" وہ چشمے کے اوپر سے اسے دیکھتے خوش دلی سے مسکرائے۔

"یاد ہے، آپ نے شادی کے دوسرے دن کہا تھا، جو مانگنا ہے مانگو، جو بھی خواہش ہوگی وہ پوری کروں گا تب میں نے کہا تھا جب ضرورت ہوگی، آپ ہی سے مانگوں گی۔"

"ہاں ہاں بالکل یاد ہے۔ بولو کیا چاہیے، نئے ماڈل کی گاڑی، نیا بنگلہ، زیور، زمین؟"

"پہلے آپ وعدہ کریں گے پھر بتاؤں گی۔"

"ہاں بھئی! ہم اپنی زبان سے نہیں پھرتے۔"

"آپ کی اجازت اور تعاون چاہیے۔"

"کس بات کے لیے؟"

"گاؤں میں اسکول کھولنے کے لیے۔ بابا جان! میں چاہتی ہوں اسکول کی عمارت سے غیر ضروری چیزیں سامان اٹھوائیں اور فرنیچر ڈلوائیں تاکہ میں ٹیچر ارینج کر کے اپنی نگرانی میں تعلیم کا آغاز کروں۔"

بابا جان کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"بابا اسکول کھولنے کا کیا فائدہ، عورتیں پڑھ لکھ کر بغاوت کریں گی۔" انہوں نے چشمہ اتار کر ٹیبل پر رکھا۔

"نہیں بابا جان! وہ بغاوت نہیں کریں گی۔ وہ باشعور ہو کر آپ کی احسان مند ہوں گی۔ وہ اپنے مردوں کا بازو بنیں گی۔"

بڑے سردار کے ماتھے کی شکنیں بہت واضح تھیں۔

"بابا جان! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔" اس نے لجاجت سے کہا۔

"ہاں بابا! ہم اپنی زبان سے نہیں پھریں گے لیکن یہاں لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے۔ وہ نہیں مانیں گے۔" انہوں نے گلا کھنکار کر جواباً کہا۔

"بابا جان! عورت اور مرد مل کر بہترین سماج کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔ تربیت تو ماں کرتی ہے، اگر وہ ان پڑھ رہے تو معاشرے میں سدھار نہیں آسکتا۔ قائداعظم نے کہا تھا کہ مجھے پڑھی لکھی مائیں دو، میں تمہیں پڑھی لکھی قوم دوں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہاں کے لوگ ایسی باتیں نہیں مانتے۔" اس کے دلائل پر وہ جھنجلا گئے۔ ایک لمحہ کے لیے وہ خاموش ہو گئی۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں بابا جان! کہ یہاں کے لوگ آپ کی نافرمانی اور حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ جبکہ ان کو یہ بھی پتا چل جائے کہ اسکول چلانے والی آپ کی بہو ہے۔ بابا! میں بہت مان سے آپ کے پاس آئی ہوں۔"

وہ اس کے التجائیہ انداز پر کچھ دیر تک سوچتے رہے، پھر بے دلی سے بولے۔

"ٹھیک ہے۔ اگر تم لوگوں کو رضامند کر سکتی ہو تو ہم اسکول خالی کروا دیں گے۔"

"تھینک یو بابا جان، تھینک یو۔" وہ خوش ہو کر بولی تھی۔

اک بھونچال تھا، جس نے سب کو پریشان کر دیا۔ کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ بڑے سردار کی بہو چھوٹے سردار کی شہری بیوی یوں باہر نکل کر اسکول چلائے گی اور گاؤں کے گھروں میں گھس گھس کر لڑکیوں کو اسکول میں داخل کرے گی۔ اس کے تو صرف آنے پر ہی ان غریبوں کے سر جھک جاتے، انکار کی تو مجال ہی نہ تھی۔ وہ تو عزت سے بات کرنے پر ہی شکر گزار تھے۔

✿ ✿ ✿

"تم روز گھر سے نکل جاتی ہو، برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

جھنجلاتے گوہر کو دیکھتے اسے خوف زدہ عائشہ یاد آئی۔

"بی بی! اگر آپ روزانہ آئیں گی۔ تو یہ اسکول چلے گا۔ سرداروں کے لوگ آکر پہلے دن ہی بند کروا دیں گے۔ پہلے بھی یہاں ایسا ہوتا آرہا ہے۔ یہ نہ ہو کہ مجھے ہی جان کے لالے پڑ جائیں۔"

عائشہ کے خدشات اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

"دیکھو گوہر! اسکول میں لڑکیوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے زیادہ ہو چکی ہے۔ انہیں ایک عائشہ نہیں پڑھا سکتی۔ گاؤں میں کوئی اور لڑکی پڑھی لکھی نہیں ہے جو میں اس کی مدد کے لیے رکھوں، ہم دونوں مل کر پڑھاتے ہیں۔"

"تو شہری رکھ لو۔"

"ہاں۔ اس بار آپ کے ساتھ چلوں گی تو ٹیچر کو بھی لے آؤں گی، مگر پھر بھی میرا جانا تو ضروری ہے ناں۔" کسی ادارے میں چیک اینڈ بیلنس نہ ہو وہ ادارہ ڈوب جاتا ہے۔

"تم نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کیا سماج میں تبدیلی کا؟" وہ غصے سے بولا۔

"میں پہلے ہی کہتی تھی بیٹا! حویلی کے اندر شہری عورت کا کیا کام، مگر تو مانا نہیں، آج وہ تجھ سے ٹکرا رہی ہے۔" اس کی ساس نے طنز کیا۔

"ہاں! مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ اتنی بڑی بے وقوفی کرے گی کہ بابا کے سامنے جا کر کھڑی ہو جائے گی۔"

✿ ✿ ✿

وہ بہت پریشان تھی۔ اک طرف گوہر کا بدلتا رویہ، دوسری طرف ان غریب عورتوں کے دکھ جو کسی پل چین سے نہ رہنے دیتے۔ وہ عجیب دوراہے پر کھڑی ہو جاتی جیسے پانی اور آگ کے بیچ۔ گوہر اور اس کے درمیان انسانیت کی لمبی خلیج تھی، جو وہ صرف محبت سے نہیں پاٹ سکتی تھی۔

وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آئی تو گوہر اٹھ رہا تھا۔ اس کی ذاتی ملازمہ نے اس کو واسکٹ پہنائی، پھر لیپ ٹاپ اٹھا کر اس کو گاڑی تک چھوڑنے گئی۔

ڈرائیور نے مستعدی سے دروازہ کھولا اور گوہر سے لیپ ٹاپ لے کر سائیڈ پر رکھا۔ گلشن سے کچھ کہا، وہ سر ہلاتی مسکراتی ہوئی پیچھے ہٹی۔ جب تک گاڑی گیٹ سے نکل نہ گئی، وہ وہیں کھڑی رہی۔ پھر لاابالی پن سے پراندہ ہاتھ سے جھلاتی لان کی طرف چلی گئی۔ شیشے کی دیوار سے نظر آنے والے منظر پر اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔

"کیا گوہر گلشن کو میرے مقابلے پر لا رہا ہے؟"

پہلی بار جب اس نے گلشن کو گوہر کے کپڑے نکالنے سے منع کیا تو گوہر نے کہا۔ "تمہاری آسانی کے

لیے رکھی ہے' تم خود تیار ہو کر اسکول جاتی ہو' یہ میرا کام کر دیتی ہے۔"

"نہیں گوہر! میں تمہارے جانے کے بعد چلی جاؤں گی۔ تمہاری چیزیں سنبھالنے' رکھنے' اٹھا کر دینے میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔" اس نے ہنس کر کہتے ہوئے گلشن کے ہاتھوں سے کوٹ لے لیا تھا۔

"مگر آج کے بعد میرا ہر کام گلشن ہی کرے گی۔" گوہر کے رخ اور اٹل لہجے نے اسے حیران کیا تھا۔ اس دن کی بحث کے بعد گوہر اس سے بہت اکھڑا اکھڑا تھا۔

پاس کھڑی نئی نیچر روزینہ نے' جسے اس نے اپنے ساتھ حویلی میں ٹھہرایا تھا' اس کی نظروں کے تعاقب میں سارا منظر دیکھا۔ اور آنکھوں کی نمی پر متاسف ہوئی تھی۔

"تم نے ناشتا کیا؟" وہ اسے دیکھ کر بولی۔

"جی ہاں۔ ابھی کر کے ہی آرہی ہوں' ملازمہ کمرے میں ناشتا دے جاتی ہے۔"

"اچھا چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔ عائشہ انتظار کر رہی ہو گی۔"

"آپ ناشتا نہیں کریں گی؟"

"نہیں بھوک نہیں ہے۔ اسکول میں چائے پی لوں گی۔ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟" اس نے بات بدلنے کے لیے پوچھا۔

"نہیں' بالکل بھی نہیں۔" وہ مسکرائی۔

عائشہ گاؤں کی واحد انٹر پاس لڑکی تھی۔ وہ بھی اس گاؤں کی نہ تھی۔ قریبی شہر سے اپنی ماسی کے بیٹے سے بیاہ کر اس گاؤں میں آئی تھی۔ جب اس نے گاؤں میں کسی بھی طرح کی تعلیم کا رجحان نہ دیکھا تو وہ گھر میں کمہاروں کے مٹی میں کھیلنے والے بچوں کو پکڑ کر گھر میں پڑھانے لگی۔ یہ سلسلہ دو ماہ ہی چلا ہو گا کہ سردار تا دار آگیا۔ بڑے سردار نے بلاوا بھیجا تھا۔ "شام کو سارے کمہار سردار کی اوطاق پر جمع ہوں۔"

پیرو' بخشو' بالکو' جی سائیں' حاضر سائیں!" کہتے وہ صدیوں سے بندھے ہاتھ اور جھکے سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔

"سنا ہے تمہارے گھر میں اک نیا فساد پیدا ہوا ہے۔ اب وہ پیرو کی بہو بچوں کو پڑھا رہی ہے۔ اور شہر کے اسکول میں نام بھی داخل کروا آئی ہے۔" سردار نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

"تم لوگ اپنے بچوں کا مستقبل کیوں اندھیر کرتے ہو' اپنا آبائی دھندہ دو بازی سکھاؤ' یہاں تو اچھے گھروں کے نوجوانوں کو نوکریاں نہیں ملتیں' پڑھ لکھ کر بے کار بیٹھے ہوئے ہیں' تو تمہارے بچے کون سے افسر لگ جائیں گے۔ ارے نویں' دسویں جماعت کا خرچہ بھرنے کی تو تم لوگوں میں سکت نہیں' یونیورسٹی تک کیسے پڑھاؤ گے ہنر سکھاؤ ہنر' جو پیٹ بھرے۔"

"ہا سائیں ہا۔ ہنر تو بادشاہ ہے' کبھی بھوکا نہیں مرتا ہنر مند۔"

بالکو نے اجرک کے پلو سے پیشانی سے پسینہ پونچھا اور تائید کی۔

"ہا۔ بھوتار سائیں آپ ہمارے محسن ہیں بھلا چاہتے ہیں' تب ہی نصیحت کر رہے ہیں۔" بخشو نے بھی ڈرتے ڈرتے زبان کھولی۔

"پیرو! تم نے شہر میں بیٹے کا رشتہ کرتے وقت ہم سے اجازت لی تھی؟" ان کی گھورتی نگاہوں نے پیرو کی جان نکال دی۔

"سائیں! بھوتار سائیں! آپ کو اللہ سائیں زندگی دے۔ ان دنوں طبیعت کچھ ناساز تھی' علاج کرانے لندن گئے تھے۔ چھوٹے سردار سے اجازت لی تھی' پھر رشتہ کیا تھا۔"

"میرے آنے کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بھگدڑ مچی تھی' یا لڑکی گھر سے بھاگ جاتی جو اتنی جلدی مچائی۔ میں آتا' دیکھ بھال کرتا' لڑکی کیسی ہے' کس خاندان کی ہے' پھر رشتہ کرتے۔"

"بھوتار سائیں! آپ کی بیماری کا بھی خیال نہیں آیا۔ ڈھول باجے بجا دیے۔" کمدار نے جلتی پر تیل ڈالا۔

"نہیں سائیں نہیں۔ آپ کی صحت یابی کی خوش خبری ملی تھی۔ حویلی سے میری بیوی اجازت لے کر آئی تھی' پھر میں نے بیٹے کی شادی کی۔ لڑکی بھی دیکھی بھالی تھی۔ میری سالی کی بیٹی ہے سائیں!" وہ ہاتھ جوڑ کر صفائی پیش کرنے لگا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے' جو ہونا تھا ہو چکا' مگر اب اپنے بچوں کو آبائی پیشہ سکھاؤ اور یہ پڑھائی شڑھائی کا کھڑاگ بند کرو۔"

بڑے سردار کے چہرے پر پڑے بلوں نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا اور ان سب لوگوں نے "حاضر سائیں" کہہ کر ہمیشہ کی طرح سر جھکا دیا۔

✿ ✿ ✿

ان ہی کمہاروں کے گھر کے باہر ایک دن چھوٹے سردار کی بہو کو دیکھ کر لپے تھاپتی عورتوں کے ہاتھ رک گئے۔ گھڑوں سے پانی نکال کر لال صابن سے ہاتھ مل مل کر ہاتھ دھو کر عائشہ کی ساس اسے پکارتے آگے بڑھی۔

"ارے عائشہ! بستر بچھا' بڑے سردار کی بہو آئی ہے۔" عائشہ نے فوراً "رلی" بچھائی۔

"سومل بی بی! یہاں بیٹھیے۔"

"عائشہ! میں تم سے ملنے آئی ہوں' مجھے اسکول کے لیے ٹیچر چاہیے۔"

"بڑے سردار نے گھر میں تو پڑھانے کی اجازت نہ دی' اسکول میں کیسے دے گا؟"

"بڑے سردار سے میں نے اجازت لے لی ہے' اس کی تم پروا نہ کرو۔"

"آپ بڑے سردار کی بہو ہیں' اس لیے اعتبار کر رہی ہوں' ورنہ اب تو اعتبار کرنے کو دل نہیں چاہتا۔"

بڑے اعتماد کے ساتھ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے عائشہ نے کہا تھا۔ ایسی ہی مضبوط لڑکی کی ضرورت تھی۔

سومل بی بی! دراصل اس کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بڑے سردار کے آدمی ہیں۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔

اس کی ساس بہو کے اعتماد سے ڈر گئی۔

"اصل میں ہم جھکے سروں والے کمزور لوگ ہیں ہمارے کبھی نہ سر اٹھیں گے نہ کمریں سیدھی ہوں گی۔"

عائشہ کی ذو معنی بات اسے سوچ میں ڈال گئی

"مجھے تمہاری یہ خود اعتمادی اچھی لگی مگر یہ بتاؤ کہ ان لوگوں کے معاشرے میں تمہارا قد کیسے بلند ہو گیا؟"

"اس لیے کہ خوش قسمتی سے میں یہاں کی رہنے والی نہیں۔ میرا باپ شہر میں نوکری کرتا تھا۔"

✿ ✿ ✿

"ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ اک آئیڈیل معاشرہ کیسا ہونا چاہیے۔ وہ معاشرہ جہاں ہر فرد کو زندگی کی بنیادی سہولیات مہیا ہوں۔ غلامی کا شکار معاشرہ فرد کی صلاحیتوں کو مردہ کر دیتا ہے۔"

اسکول سے آتے ہوئے گاڑی میں چلنے والے ایف ایم ریڈیو اسٹیشن پر گوہر علی تمکنی کو سندھی ادبی سنگت کی تقریب میں ادیبوں سے خطاب کرتے ہوئے سنا تو اس کے دل میں مبہم سی امید پھر سے زندہ ہو گئی۔ گوہر کے اندر انسانیت مری نہیں ہے۔

یہ وہی خواب دیکھنے والا تو اسٹوڈنٹ تھا جس کی باتوں نے سندھ یونیورسٹی میں اس کے نظریات کو چاہت اور محبت کی امربیل میں جکڑ دیا۔ پھر وہ اس امربیل میں ایسی جکڑی کہ پھر فرار کا کوئی رستہ نہ بچا۔

"سومل بی بی! سردار گوہر خان کے خیالات و نظریات تو بہت اعلا ہیں۔" روزینہ نے کہا۔ اس نے مسکرا کر روزینہ کو دیکھا۔

"ہاں اس کے ایسے ہی خیالات نے تو مجھے اس کا اسیر بنایا تھا' مگر یہاں آکر مجھے پتا چلا کہ اس کی ذات تو بہت تضادات کا شکار ہے۔ پیسے کی افراط اور طاقت کا نشہ بہت بری چیز ہے۔ بہت کم لوگ تاریخ انسانی میں ان دو چیزوں کو سنبھال پاتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں سول بی بی! مگر آج کی گوہر علی خان کی تقریر بہت شان دار تھی۔" روزینہ نے حویلی میں اندر داخل ہوتے ہوئے تعریف کی۔

"ہاں اس نے میرے اندر بھی پھر سے امید کی کرن زندہ کردی ہے۔"

وہ سارا دن اس کے انتظار اور بیتی یادوں کی نذر ہوا۔ اس کو گوہر کے کپڑے استری کرکے رکھتی ہوئی گلشن بھی بری نہیں لگی۔ شاید میری توجہ کم ہو گئی تھی جب ہی وہ گلشن کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ مردوں سے ایسی چھوٹی موٹی غلطیاں تو ہوتی رہتی ہیں۔

وہ اسے ہر جرم سے بری الذمہ قرار دیتی رہی۔ رات کو وہ بہت دیر سے آیا تھا۔ وہ اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

"اتنی دیر کردی؟" گوہر کی اتاری ہوئی واسکٹ اپنے بازو پر رکھتے ہوئے وہ محبت سے بولی۔

"میرے خیال میں کافی عرصے سے میرے آنے کا یہی ٹائم ہے۔" اس نے چبھتے لہجے میں کہتے ہوئے بغور اس کو دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ لیکن آج تمہارا انتظار بہت شدت سے تھا شاید اس لیے ایسا محسوس ہوا۔"

"کیوں خیریت؟ پھر کوئی نیا مطالبہ کرنا ہے؟"

اس نے گوہر کے طنزیہ لہجے کو یکسر نظر انداز کردیا۔

"آپ کی آج کی تقریر نے یونیورسٹی کی بیتی یادیں تازہ کردیں۔ وہ آدرش اعلا قدروں کی خوشبو باتیں جو آنکھوں میں تبدیلی کے خواب سجا دیتی تھیں محسوس کرا دیتی تھیں۔ گزرتے وقت کے ساتھ مجھے لگا کہ سرداری نظام نے وہ خواب تمہاری آنکھوں سے چھین لیے ہیں۔ مگر آج لگا تمہارے اندر ابھی بھی انسانیت زندہ ہے۔"

اس کی ملائمت سے کہی گئی باتوں پر وہ خوش گوار انداز میں ہنسا اور اس کی کمر میں بازو حمائل کرتے ہوئے بولا۔

"شکر ہے مجھے تم انسان تو تسلیم کرتی ہو۔"

"صرف انسان نہیں اپنا محبوب اور شوہر بھی۔" وہ شرارتی لہجے میں بولی۔

اس نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگا کر سینے کے قریب کیا۔ سول نے چند لمحے بعد اس کے سینے سے سر اٹھا کر کہا۔

"صرف سردار تسلیم نہیں کرتی۔"

"وہ تو میں ہوں۔" اسی شرارت سے جواب آیا۔

کتنے ہی عرصے بعد اس نے محبت کی ننھی ننھی بوندوں سمیت کراچی تشنگی کو سیرابی دے کر پیاس بجھائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اگر لوگوں کا ذوق و شوق اور آپ کی لگن یہی رہی تو اسکول کی یہ عمارت تنگ پڑ جائے گی۔" چھٹی کے وقت بچوں کو گیٹ سے نکلتے دیکھ کر عائشہ نے خوش دلی سے تجزیہ کیا۔

"تنگ پڑ جائے گی تو وسیع کرلیں گے۔ پھر ہائی اسکول بنوانے کا بھی ارادہ ہے۔ اگر زندگی رہی تو۔" وہ مسکراتے نیم کی چھاؤں تلے آگئی۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں۔ اللہ آپ کو زندگی دے۔" روزینہ نے فوراً" دعا دی۔

"سول بی بی! آپ تو ہم اندھوں کی بیساکھی ہیں۔ آپ کے بغیر ہم بالکل معذور ہیں۔" عائشہ نے اپنائیت سے کہا۔ تینوں چلتی ہوئی باہر آئیں۔ اس کو دیکھ کر ڈرائیور نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اس نے عائشہ اور روزینہ کو ساتھ بٹھایا۔

راستے میں ملنے والے لوگوں میں کسی نے ہاتھ جوڑے، کسی نے سلام کیا، کسی نے سردار کی حویلی کی گاڑی دیکھ کر خوف سے سر جھکا دیا۔

پیپل کی چھاؤں میں اس نے تمینہ اور ثمینہ کو کھڑے دیکھا تو گاڑی رکوالی۔

"یہاں پر کیوں کھڑی ہو؟"

"سول بی بی! بابا کا انتظار کررہے ہیں، پتا نہیں لینے کیوں نہیں آیا۔" ثمینہ نے وضاحت دی۔

"آجاؤ میں چھوڑ دیتی ہوں۔"

روزینہ اتر کر فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی اور وہ دونوں

لڑکیاں پیچھے اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

"ہو سکتا ہے دکان پر گاہک زیادہ ہو گئے ہوں۔ تب ہی بابا کو دیر ہو گئی ہو۔" ثمینہ نے قیاس آرائی کی۔

"پہلے ان کو چھوڑتے ہیں پھر عائشہ کو اور بعد میں گھر چلتے ہیں۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔ تمینہ اور ثمینہ پسینے میں شرابور تھیں۔ انہیں دیکھ کر اسے عائشہ کی احتیاط یاد آگئی۔

"یہ بہنیں اتنی خوب صورت ہیں کہ انہیں سب کی نظروں سے چھپا کر رکھنے کو جی چاہتا ہے۔" اور اس نے تائید کی تھی۔ واقعی حسن اور ذہانت کم ہی یکجا ہوتے ہیں۔

آج سنسان چلچلاتی دھوپ میں ان کو اکیلے کھڑے دیکھ کر اس کے دل میں خوف جاگا تھا۔

کالا نور کا گھر گاؤں کے آخری کونے پر تھا۔ سرداروں کی جاگیر شروع ہو چکی تھی۔

تمینہ اور ثمینہ کو گھر کے دروازے پر چھوڑ کر وہ واپس جارہی تھی تو دو نوجوان ہاریوں کے پیروں میں بیڑیاں دیکھ کر وہ ٹھٹکی۔ اس نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا اور نیچے اتر آئی۔

وہ دونوں ساتھ ساتھ کام کررہے تھے۔ ایک نے رک کر اسے دیکھا۔ دوسرے نے یہ زحمت بھی گوارا نہ کی، کام میں جتا رہا۔

"تمہارے پاؤں میں بیڑیاں کس نے ڈالی ہیں؟"

اس نے غم و غصے سے استفسار کیا۔ مگر اسے جواب نہیں ملا۔

سیاہ جثہ والے نے اک نظر دیکھا، پھر کام میں منہمک ہو گیا۔ اس کی پشت سے پسینے کی لڑیاں بہہ کر شلوار میں جذب ہوتی رہیں۔ جیسے وہ سننے، سمجھنے، سوچنے، جواب دینے کی صلاحیتوں سے محروم ہو چکے ہوں۔

"غلامی شاید انسان کو گونگا بہرا کردیتی ہے۔"

اس نے پاؤں میں بیڑیوں کی جگہ سرخ زخموں کے نشان دیکھتے افسردگی سے سوچا۔ جلتی دھوپ نے چند منٹ میں اسے پسینے سے شرابور کردیا تھا مگر وہ ہاری گدھوں کی طرح کام میں جتے تھے۔

اسے وہاں کھڑا دیکھ کر آہستہ آہستہ عورتیں اور بچے کام چھوڑ کر اس کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ وہ بڑے سردار کی بہو کو یوں دھوپ میں کھڑے اچنبھے سے دیکھتے رہے۔ ان کی زبانیں تالو سے چپکی ہوئی تھیں۔ پھٹے ہوئے گھاگھروں پر جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔

"یہ بچے پڑھتے نہیں؟" جواب ندارد۔

"تم سب لوگ یہیں پر کام کرتے ہو؟" کسی نے زبان نہیں کھولی۔ ارد گرد خوف زدہ نظریں گھماتے رہے۔

"گونگے بہرے ہو! سارے ایک جگہ کھڑے ہو کام چھوڑ کر، مفت کے ٹکر توڑتے ہو، دانا پانی بند کرواں گا، قینچیوں! جہاں کوئی حسین لڑکی دیکھی آنکھ مٹکا کرنے کھڑے ہو گئے۔" اس نے بکتے ہوئے چھڑی چند لوگوں کو ماری۔

اس کی لو دیں جلنے لگی۔ عورت کتنی ہی طاقت ور ہو جائے۔ مردانہ معاشرے میں اسے صرف ایک نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

"زبان سنبھال کر بات کر کمدار! یہ سردار گوہر علی خان کی بیگم ہیں۔" ڈرائیور نے غصے سے کہا۔ کمدار ٹھٹک گیا۔ فوراً" ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"معاف سائیں! معاف کریں، آپ کو پہچانا نہیں۔"

"ان کے پاؤں میں بیڑیاں کیوں ہیں؟"

"سائیں بھگوڑے ہیں، کئی بار بھاگ چکے ہیں اس لیے مجبوراً" ڈالنی پڑیں۔"

"یہ کیوں بھاگتے ہیں؟ کیا وجہ ہے، کیا تم ان کا حساب نہیں چکاتے ٹھیک سے؟"

وہ نوجوان جو سر جھکائے کام میں مگن تھا۔ اس نے اپنے حق میں اٹھنے والی آواز پر کمر سیدھی کرکے پہلی بار دیکھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں بغاوت کا غصہ چمکتا

تھا۔

"سائیں۔ ان کے اوپر تو اتنا قرضہ ہے کہ ان کی سات پشتیں کمائیں تو بھی نہ اترے۔ ان کو تو دو وقت کا کھانا بھی اپنے پلے سے کھلاتے ہیں۔" وہ خوشامدی لہجے میں بولا۔

اس نے مٹی کے برتنوں میں سفید چاولوں کے بھت کو دیکھا جس میں برائے نام مرچیں تھیں اور کچھ نہیں۔

اس کا تنفس غصے میں تیز ہو رہا تھا۔ "ان کو ان کی اجرت دے دیا کرو۔ ان کے قرضوں کا حساب کتاب میں خود چھوٹے سردار سے پوچھ لوں گی۔ اور ہاں! آج کل سے یہ سارے بچے کھیتوں میں کام نہیں کریں گے۔ ان کو اسکول بھیجنا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

"سائیں! یہ بھیل ہیں بھیل۔" کمدار نے دونوں ہاتھوں سے ان کی طرف اشارہ کر کے حیرت سے کہا۔

"کیوں۔۔۔ بھیل انسان نہیں ہوتے؟" اس نے غصے سے سوال کیا' کمدار تھوک نگلنے لگا۔

اسی وقت کسی شیر خوار بچے کے زور زور سے رونے پر اس نے آواز کا تعاقب کیا۔ ببول کے درخت کے نیچے ایک میلی کچیلی رلی کے ٹکڑے پر ایک بچہ بھوک اور گرمی سے بلبلا رہا تھا۔ وہ چلتی ہوئی بچے کے پاس آئی۔

"کہاں ہے اس کی ماں؟"

گندم کی کٹائی کرتی' درانتی رکھ کر ایک لڑکی خوف زدہ نظروں سے کمدار کو دیکھتی اٹھی اور آکر بچے کو گود میں اٹھایا۔

"آج سے کوئی بھی شیر خوار بچے کی ماں فصلوں میں کام نہیں کرے گی۔ کمدار! تم میری باتیں سمجھ رہے ہو نا؟" اس نے غصے سے کہا۔ دل تو کر رہا تھا کہ کمدار کو گولی مار دے۔

"جی۔۔۔ جی۔۔۔ جو حکم سائیں!" کمدار نے خوشامدی لہجے میں کہتے ہاتھ جوڑے۔

"کہاں ہے تمہارا گھر' لے جاؤ اس بچے کو مر جائے گا اس دھوپ میں۔"

وہ لڑکی تشکر آمیز نظروں سے دیکھتے چلی گئی۔

"ان کے گھر نہیں ہوتے بڑے سے چھپر ہوتے ہیں' جہاں ان کو قید کیا جاتا ہے اور علی الصباح ہانک کر لایا جاتا ہے۔ یہ معمول کے کمی ہیں۔ مگر جن دنوں میں زمینوں پر کام زیادہ ہو تو گاؤں کے لوگ بھی مفت میں بیگار بھرنے آتے ہیں۔ سردار کی ناراضی مول لینے کی کسی میں بھی ہمت نہیں۔ کیا مسلمان کیا ہندو۔" عائشہ اسے تفصیلات بتانے لگی۔

دیا موری ہو پہنچ نہ رہیو بیکڑو
اچی ڈھنڈ بھری کو زن گنبھو سان
(مور اب مر گئے ہنس ایک بھی نہ رہا
اب جھیل جھوٹے کووں سے بھر چکی ہے۔)

عائشہ نے شاہ لطیف کا بہت ٹھنڈی سانسوں سے پڑھا تھا

موول آج کے دن کے بعد تمام واقعات پر سخت صدمے میں تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کیا کر ڈالے۔ بہت مشکل سے۔۔۔ کی گھر پہنچی۔ دوپہر کے واقعات سے ابھی تک ملول تھی۔ نہانے اور نیند لینے کے بعد اس کی طبیعت کا اضمحلال کم نہیں ہوا تھا۔

* * *

"تم ہمیں ذلیل کرنے پر تلی ہوئی ہو موول! تمہیں ضرورت کیا تھی بھیلوں سے بات کرنے کی۔" گوہر غصے سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"سیانے سچ کہتے ہیں' عورت کو کبھی بھی علم و عشق سے غرض نہیں ہونی چاہیے۔"

"تم بھول رہے ہو کہ مجھے عشق کی پرپیچ راہوں پہ تم نے چلایا ہے' اور میرے علم کی وجہ سے ہی مجھے اپنایا۔" ہزاروں دکھوں سے راستہ بناتے وہ بمشکل بول سکی۔

"ہاں' وہ میری غلطی تھی۔ بھیانک غلطی جس پر میں پچھتا رہا ہوں۔"

حبس و گھٹن نے اس کے سانس لینے کے عمل میں دشواری پیدا کی۔

"آج سے تم کہیں نہیں جاؤ گی اور یہ اسکول

ڈھونگ بند کر دو تو بہتر ہے۔" اس کے تحکمانہ حتمی لہجے پر وہ حیران ہوئی۔

"گوہر! تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ بے یقینی سے گویا ہوئی۔ "میں اپنے خاندانی وقار کے آگے مجبور ہوں۔"

"خاندانی وقار کا تب کیوں نہیں سوچا' جب ایک یونیورسٹی کی پڑھی لکھی ڈھیٹ سوشل ورکر کو شریک سفر بنایا۔"

"بھاڑ میں جائے تمہارا سوشل ورک' ویلفیئر سوسائٹی اور حلقہ دانش' تمہاری اب جو بھی پہچان ہے' سردار گوہر علی خان کی بیوی کی حیثیت سے ہے۔"

"اس حیثیت کے بوجھ نے ہی تو شل کر رکھا ہے ورنہ میں چاہوں تو بہت کچھ کر سکتی ہوں۔" وہ تدبر سے بولی۔

"مجھے باغی اور بغاوت' دونوں سے نفرت ہے۔ میں کسی صورت باغی بیوی قبول نہیں کر سکتا۔"

"بغاوت کو روکنا چاہیے' تکرار تو کو نہیں۔ آپ لوگ بغاوت تک معاملات کو جانے ہی کیوں دیتے ہیں؟" اس نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔

"تم یہ ہی چاہتی ہو نا کہ موول! ہمارے کمی کمین ہم سے باغی ہو جائیں۔ ان کے جھکے ہوئے سر ہمارے آگے اٹھ جائیں۔ تم ہماری سلطنت کے لیے خطرات پیدا کر رہی ہو۔ ہماری بادشاہی چھیننا چاہتی ہو۔ یہ جو لوگ تمہارے آگے پھرتے ہیں نا یہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے تو ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالیں گے۔ تھوکیں گے تمہارے منہ پر۔ یہ جو اتنا تن کر چلتی ہو' یہ صرف ہماری طاقت و سلطنت کے مرہون منت ہے۔"

گوہر کے سخت لہجے اور آواز کی سختی نے اس کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"مجھے ایسا لگتا ہے گوہر! جیسے تم مجھے گنوا رہے ہو۔" اس کے اندر مری محبت کراہی۔

"میں تمہیں گنوا رہا ہوں؟ تم مجھے نہیں گنوا رہیں؟" بھنویں سیکڑتے طنزیہ سوال کیا۔

"نہیں۔ تم تو میرے تھے ہی نہیں' تم تو اپنے خول میں بند ایک وڈیرے ہی تھے بس۔"

"اور میں وڈیرا ہی رہوں گا' یہ بات کبھی نہ بھولنا۔" وہ برہمی سے کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

زندگی کتنی مشکل' ناہموار اور رنجیدہ ہو گئی ہے۔

مایوسی موت کی صورت اس کے سامنے تھی۔

اسے لگ رہا تھا اس کے پاس شاید انمول خوابوں' اعلا خیالوں اور اونچے آدرشوں کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

اس رات بہت حبس تھا۔ معاشرے کے حبس کی طرح' اور گھٹن ظلم کے اندھیرے کی طرح' بجلی لائٹ چلی گئی تھی۔ وہ پسینے میں نہا گئی۔

کروٹ بدل کر دیکھا خالی بستر اس کو منہ چڑا رہا تھا۔

وہ یقیناً غصے میں گھر نہیں آیا یا تو فارم ہاؤس چلا گیا یا باہر اوطاق میں سو گیا ہو گا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل سے سیل فون اٹھا کر آن کیا۔ اس کی روشنی میں اٹھ کر کھڑکی کھولی۔ تاروں کے جھرمٹ میں چاند دولہا بنا مسکرا رہا تھا۔

مدھم چاندنی چوری چھپے اندر آئی' اس کے شل اعصاب کو کچھ سکون ہوا کہ اچانک نسوانی چیخ نے فضا میں ارتعاش پیدا کیا۔

اسے صرف ایک لمحہ لگا پہچاننے میں' دوسرے لمحے اس نے روزینہ کے کمرے کی طرف دوڑ لگا دی۔

"کیا ہوا روزینہ! دروازہ کھولو۔" وہ مسلسل دروازہ پیٹ رہی تھی۔ مگر اندر سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ وہ فوراً گھوم کر پچھلی طرف آئی۔ کھڑکی سے کودنے والے بڑے سردار کو اس نے چاندنی میں اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ سرعت سے حویلی گیٹ کھول کر باہر چلے گئے۔ اس کی سانس سینے میں اٹک گئی۔ دم رکنے سا لگا تھا۔

مردہ قدموں سے چلتے ہوئے کھلی کھڑکی کی طرف سے اندر آئی۔ اسے دیکھ کر ڈری سہمی روزینہ کی جان میں جان آئی۔ وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے اس کے

گلے آ گئی۔ ان دونوں کے دل کی دھڑکن خوف سے احتجاج کر رہی تھی۔

"سب۔۔۔ خیریت۔۔۔ ہوئی نا؟" ٹوٹے لفظوں سے استفسار کیا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ آپ بروقت پہنچ گئیں، ورنہ میں اپنی سب سے قیمتی متاع گنوا بیٹھتی۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ اس کی سینے میں اٹکی سانس بحال ہوئی۔

"سومل! میں اب یہاں نہیں رہوں گی۔ پلیز! مجھے صبح ہی واپس بھیج دیں۔" اس نے پلو سے اس کے آنسو پونچھے۔

"میں سمجھتی ہوں اس سازش کو۔ تمہارا یہاں رہنا اب واقعی محال ہے۔ میں تمہیں صبح حیدر آباد بھیج دوں گی۔ ابھی چلو میرے کمرے میں۔"

وہ باہر نکلیں تو شور پر آنے والی ملازمائیں ان کو دیکھ کر سر جھکا کر اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف چلی گئیں۔

وہ ایسے واقعات و حادثات سے انجان نہیں تھیں۔ طویل برآمدے کے آخری کونے میں بنے اپنے کمرے کے آگے کھڑی اس کی ساس نے ان کو دیکھ کر منہ بنایا۔

"کہا بھی تھا پرائی چھوریوں کو مت لا کر بٹھا مگر مجال ہے جو کسی کی بات مان لے، آج پتا چل گیا نا۔" وہ بڑبڑاتی اندر چلی گئیں۔

اسے سخت ہتک محسوس ہوئی، مگر یہ وقت جواب دینے کا نہیں تھا۔ وہ روزینہ کو لے کر اندر اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس نے کمرے کے دروازے اور کھڑکی کی کنڈی مضبوطی سے بند کر دی۔ روزینہ کے لہجے سے ابھی بھی خوف ٹپک رہا تھا۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کب تک یہ بلا گلے لگائے رکھو گے گوہر خان! ایسا نہ ہو کہ یہ ہماری سانس ہی لے جائے۔" وہ سگار کا کش لگا کر بیٹے سے مخاطب ہوئے۔ "گھر کا بھیدی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔ گھر کو گھر کے چراغ سے ہی آگ لگتی ہے۔"

"جی بابا سائیں! کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" گوہر پرسوچ انداز میں بولا۔

"اپنی پتوار مضبوطی سے پکڑے رہو اور چراغ کو باد مخالف سے بچاؤ۔ سوار کے پاس سواری نہ رہے تو پیادہ اور سوار کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ پھر سب برابر ہو جاتے ہیں۔ سب پیادے۔ ساری اونچ نیچ ختم۔" وہ لان میں ٹہلتے اضطراب و غصے سے بول رہے تھے۔

"بابا سائیں! مجھے اندازہ ہے۔"

"ہمیشہ ہوا میں گھوڑے چلاتے ہو اور اندھیرے میں تیر پھینکتے ہو۔ ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہی دانش مندی ہے بیٹا!"

"جی جانتا ہوں۔" وہ کچھ پریشان ہو کر بولا۔

"ایسا نہ ہو کہ ہمارے ہی گھر سے اٹھنے والی طاقت ور آواز ہماری ہی آوازوں کو پست اور اونچے قد کو نیچا کر دے۔" انہوں نے تیر نشانے پر بیٹھتے دیکھ کر بیٹے کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"یاد رکھو، میں نے روایات پر کبھی سمجھوتا نہیں کیا۔ سردار اپنے اصولوں سے ہٹ جائیں تو ان کی سرداری ان کے پاس نہیں رہتی۔"

"میں حکمت عملی بنا رہا ہوں بابا سائیں! جلد ہی اس سانپ کو کچلنا پڑے گا۔" اس نے ہاتھ پشت پر باندھ کر کہا۔

"صرف کچلنا نہیں بیٹا! اس کی آنکھوں سے اپنا عکس بھی نوچ لو۔ یاد رکھو اگر عکس آنکھوں میں ٹھہر جائے تو وہ سب سے بڑے انتقام کی نشاندہی اور ثبوت بن جاتا ہے۔"

گوہر نے لب بھینچ کر اثبات میں سر ہلایا۔

"آپ فکر نہ کریں۔"

"شاباش بیٹا۔" انہوں نے خوش ہو کر اس کے کندھے تھپتھپائے۔

"ہمارے خاص مہمانوں کے میزبان کے انتظامات مکمل ہو گئے؟"

"جی بابا جان! ان کے شکار کے لیے تیتر بھی تازہ لیے ہیں اور تیتریاں بھی۔"

وہ دونوں دل کھول کر ہنسے۔

☼ ☼ ☼

روزینہ کے چلے جانے سے بہت فرق پڑا تھا۔ اسکول میں بچوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو سنبھالنا ان دونوں کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ اس دن وہ اسکول پہنچی تو پتا چلا آج کاکا نورل کی دونوں بیٹیاں اسکول نہیں آئیں۔

"گھر میں کوئی کام کاج ہو گیا ہو گا تب ہی نہیں آئی ہوں گی۔" اس نے پریشان بیٹھی عائشہ کو دلاسا دیا۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔" اس نے دل سے دعا کی، مگر ایسا نہیں تھا۔ گیارہ بجے کے قریب کاکا نورل روتا پیٹتا بیٹیوں کا پتا کرنے آیا۔

"وہ دونوں اسکول نہیں پہنچیں۔" عائشہ نے کاکا نورل کے تن سے رہی سہی جان بھی نکال دی۔ وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

وہ اسکول بند کروا کے کاکا نورل کے گھر پہنچی تو اس کی بیوی کی دہائیوں نے دل پکڑ لیا۔

"حوصلہ کرو ماسی! حوصلہ کرو۔" عائشہ نے اسے پانی پلاتے کہا۔

"ارے کیسے حوصلہ کروں۔ غریب کے پاس سوائے عزت کے اور ہوتا ہی کیا ہے۔ میری کیاری کے پھولوں نے تو ابھی خوشبو پکڑی تھی۔ ابھی تو۔۔۔۔" وہ سینہ پیٹتے ہوئے رو رہی تھی۔

چارپائی پر بیٹھی ہوئی سومل نے دونوں ہاتھوں پر سر گرا لیا۔

"تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟"

"بس بی بی جی! تہمینہ کے ابا کو بخار تھا، کہنے لگا لڑکیوں کو اسکول چھوڑنے جاؤ۔ ہم جیسے ہی گنے کے کھیت کے قریب پہنچے ایک آدمی نے کھیت سے نکل کر کلہاڑی کا دستہ میرے سر پر دے مارا۔ میں لڑکھڑا کر گری تب ہی جیپ سے نقاب پوش دو آدمی اترے۔ دونوں لڑکیوں کے منہ پر ہاتھ رکھ کر گھسیٹ کر جیپ میں ڈالا، پھر مجھے نہیں پتا میں بے ہوش ہو گئی۔ مجھے ہوش گھر میں آیا ہے۔ نہ آیا ہوتا مر گئی ہوتی تو اس درد سے ہمیشہ کے لیے جان چھوٹ جاتی، مر کیوں نہ گئی۔"

اس کے پاس الفاظ نہ تھے کہ وہ اسے دلاسا دیتی۔ گاؤں کی کئی عورتیں وہاں جمع ہو رہی تھیں۔ کھسر پھسر، دبے لفظوں میں سردار کے کمدار کا نام لیا جا رہا تھا۔

اس سے پہلے بھی ایسے حادثات ہو چکے تھے۔ جب بھی فارم ہاؤس پر غیر ملکی مہمان آتے ان دنوں اکثر گاؤں کی خوب صورت، کم عمر لڑکیاں اغوا ہو جاتیں۔ جو آٹھ دس دن بعد بے ہوشی کی حالت میں گاؤں کے آس پاس کسی کھیت میں پڑی ملتیں۔ اور ایک ماہ بعد پرائز بطور گفٹ سردار کو مل جاتی، جو گاؤں کے روڈ پر

فراٹے بھرتی گاڑیوں کی ایک لمبی لائن تھی' جو خان ہاؤس پر لگی ہوتی۔ جب بھی فارم ہاؤس پر تیاریاں زور وشور سے شروع ہوتیں گاؤں کے لوگوں کی جان خوف سے نکل جاتی کہ پتا نہیں اس بار کس کی باری آجائے گی۔ آنکھوں سے نیند اڑ جاتی مگر لڑکیاں گھروں سے بھی اغوا ہو جاتیں اور بدنامی ہمیشہ کے لیے ان کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتی۔ سب کو پتا تھا مگر سب بے بس و لاچار تھے۔

"آپ کو پتا ہے میں اپنی بچیوں کو اسکول بھیجنے کی حالت میں نہیں تھی مگر لڑکیوں کے شوق نے مجبور اور آپ کے دلاسے' آسرے نے دل بڑا کر دیا۔ تہمینہ کا ابا کہتا تھا' سردار کی بیگم نے اسکول کھولا ہے تو اب ہمیں کیا ڈر۔" وہ اس کا بازو پکڑ کر بولی۔ "خدا کے لیے میری بیٹیوں کو بچالیں۔"

"تم فکر نہ کرو میں اپنی پوری کوشش کروں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☼ ☼ ☼

وہ عائشہ کو لے کر کئی سال پہلے اغوا ہونے والی لڑکی کے گھر پہنچی۔ وہ جوان تھی مگر ادھیڑ عمر لگ رہی تھی۔ اس کے جاذب نظر نقوش اس کے گئے حسن کے گواہ تھے۔ عائشہ اس لڑکی کو خود پر بیتی روداد سنانے پر اکساتی رہی۔

وہ لڑکی بار بار انکار میں سر ہلاتی رہی۔

"اغوا کے بعد تم سے کیا سلوک کیا گیا؟" سوال کا کوئی جواب نہیں آیا۔ "کیا وہاں کسی گھر میں تمہیں رکھا گیا تھا؟"

لڑکی کی آنکھوں میں خوف زدہ دنوں کا عکس آنسوؤں کی صورت لہرایا۔

"نجی جیل کی سلاخوں کے پیچھے اور کون کون قید ہے؟"

خوف آسیب کی طرح گھر کے کونوں کھدروں میں پھیل گیا۔

"ہمیں معاف کردیں خدا کے لیے۔" لڑکی کی ساس نے اپنا دوپٹہ اتار کر سوہل کے پاؤں میں رکھ دیا' وہ فوراً "بدک کر پیچھے ہٹی۔

"یہ۔ یہ کیا کر رہی ہیں آپ بزرگ ہیں۔ کیوں گناہ گار بنا رہی ہیں مجھے۔" سوہل ششدر ہو کر بولی۔

"اگر بڑے سردار جی کو پتا چل گیا تو وہ ہمیں جان سے مار دیں گے بی بی! جو ہوا سو ہوا' یہ گئے دنوں کا قصہ ہے۔ ہماری زبانوں کے قفل نہیں کھلیں گے۔ اگر کھل گئے تو موت کے قفل بھی ساتھ کھلیں گے۔ ہم غریبوں کے پاس ایک حیا ہی تو ہے۔ کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی ہیں آپ۔" سوہل کے بڑھائے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئی بولی۔

وہ لڑکی روٹیاں پکاتی رہی اس کی بے رونقی جل رہی تھی۔ وہ ذہنی طور پر وہاں حاضر نہیں تھی۔

وہ عائشہ کو لے کر تیسری لڑکی کے پاس آئی جس کے منگیتر کے احتجاج پر چند دنوں بعد اس کی لاش نہر سے برآمد ہوگئی۔ اس لڑکی کا نام بانو تھا وہ اپنے منگیتر کے نام بیٹھی رہ گئی۔

بانو کو صبح سے بے کل تھی بھٹکی ہوئی روح کی طرح کہیں بھی اسے سکون نہیں مل رہا تھا۔ کا کا نوریل کی دو حسین کلیاں کھلنے کے لیے اغوا کی گئیں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ پورا گاؤں سراپا احتجاج ہونے کے باوجود سر جھکانے پر مجبور تھا کیونکہ سب کو اپنے گھروں کی عزتوں اور جانوں کی پڑی تھی۔

"بانو! یہ بڑے سردار کی بہو ہیں تم پر گزری قیامت کا احوال دریافت کرنے آئی ہیں۔" عائشہ کے تعارف پر بانو کی آنکھوں میں بیک وقت کئی احساس لہرائے' غصہ' بے چارگی' نفرت' حیرانی۔

"میں فارم ہاؤس جانا چاہتی ہوں' تم سے پوری تفصیل لے کر۔ شاید میں ان دو لڑکیوں کو بچالوں۔" سوہل نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا' وہ چند لمحے بے یقینی سے اسے دیکھتی رہی۔

"تم پیچھے' مجبور اور بانیل کے درختوں کے بیچ سے ایک راستہ فارم ہاؤس تک جاتا ہے۔ ظلمت کی طرح

سیاہ گیٹ سے گاڑی داخل ہوتی ہے تو بائیں طرف مصنوعی نہر ہے۔ نہر کے بالکل کنارے پر خوب صورت ہٹس ہیں اور مسلح سردار' غیر ملکی شہزادے اس ہٹ میں رہتے ہیں' پہلے پل سے گزر کر نہر کے بیچوں بیچ خوب صورت کمروں میں اغوا شدہ نوخیز لڑکیاں پہنچائی جاتی ہیں۔"

وہ خاموش ہو گئی مگر اس کی آنکھوں سے نفرت کے کوندے لپک رہے تھے۔ "لڑکیوں کو کس طرف رکھا جاتا ہے؟"

"اندر داخل ہوتے ہی جو سامنے ہٹ ہے اس میں سردار کا بیڈروم بھی ہے اور لڑکیوں کے کمرے اور تہ خانے میں نجی جیل بھی' جہاں سردار کی نہ ماننے والے لوگ قید ہیں۔ وہاں ایک موٹی سی عورت ہے' جس کے ذمہ لڑکیوں کو سجانا سنوارنا اور راضی کرنا ہوتا ہے۔ جو لڑکی زیادہ مزاحمت کرتی ہے اسے پہلے نجی جیل دکھایا جاتا ہے۔ سرپھری لڑکیوں کو ذہنی و جسمانی تشدد کر کے راستے پر لاتے ہیں۔ لڑکیاں بہت مجبور کر دی جاتی ہیں۔

انہیں سمجھایا جاتا ہے کہ مزاحمت یا ان لوگوں سے بدتمیزی کا بھیانک انجام ہو سکتا ہے۔ بس چند دن تکلیف کے گزار کر پھر اپنے گھروں کو لوٹنے کے آسرے پر وہ اپنی زبانیں بند رکھتی ہیں ہم۔"

وہ سراپا انتقام بانو سے ساری معلومات لے کر کسی حد تک مطمئن تھی کہ ٹھیک جگہ پہنچ گئی۔ عائشہ کو اس نے وہیں چھوڑا' فون پر ساری بات اپنی ماں کو بتائی اور گاڑی میں آبیٹھی۔

☼ ☼ ☼

"بی بی جی! میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' وہ اگر سردار کے عتاب سے بچ بھی گئے تو میرے بعد بھوک سے مر جائیں گے۔" اس کا ڈرائیور فارم ہاؤس جانے سے انکاری تھا۔

نو کلومیٹر پر پھیلے ہوئے فارم ہاؤس اور باغات و کھیتوں کے درمیان اس فارم ہاؤس پر وہ کبھی نہیں گئی تھی۔ جس میں خاص مہمان ہر سال شرکت کے لیے آتے تھے۔ وہ چند لمحے سوچتی رہی۔

"تم ایسا کرو منہ چھپا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ جاؤ' میں خود ڈرائیونگ کروں گی مگر تم راستہ بتاتے رہنا۔ فارم ہاؤس کے قریب پہنچنے سے پہلے میں تمہیں اتار دوں گی۔ تم کھیتوں میں چھپ کر چلے جانا۔"

"ٹھیک ہے بی بی! جیسا آپ کہیں مگر میرے آپ کے ساتھ جانے کا کسی کو پتا نہ چلے۔" وہ سخت مجبوری کے عالم میں بولا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو' اس نے فارم ہاؤس کے رستے پر گاڑی ڈال دی۔

سارا راستہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی رہی۔

اسے فارم ہاؤس پہنچنے میں کوئی دشواری اس لیے بھی نہ ہوئی اس راستے پر صرف سردار کے فارم ہاؤس اور کھیت تھے۔ اس نے پروگرام کے تحت ڈرائیور کو کھیتوں میں اتار دیا اور گاڑی سیاہ گیٹ کے پاس لا کر روک دی۔ دو گارڈ اس کی طرف آگئے۔

"گیٹ کھولو۔" اس نے رعب سے کہا۔

"سردار سائیں کی بغیر اجازت کسی کے لیے بھی گیٹ نہیں کھلتا۔" گارڈ کے تیز جواب پر وہ گاڑی سے باہر نکل آئی۔

"تمہیں نہیں پتا کہ میں کون ہوں۔ سردار گوہر علی خان کی بیگم!" اس نے غصے سے اپنے راستے میں آنے والے گارڈ کو مخاطب کیا۔

"ہٹو میرے راستے سے۔" وہ کنڈی کھول کر پیدل ہی اندر داخل ہوگئی۔

گارڈ فوراً" اس کی آمد کی اطلاع فون پر دینے لگے۔ وہ روش پر سیدھا چلتے ہوئے ادھر ادھر نگاہ ڈالتی جا رہی تھی۔

گوہر کا گارڈ پیچھے اس کی منتیں کرتا ہوا آرہا تھا۔

"بی بی جی! آپ کیا کر رہی ہیں' واپس چلیں۔" مگر وہ سنی ان سنی کر کے تقریباً" دوڑنے والے انداز میں ہٹ میں داخل ہوگئی۔

اسی وقت ایک موٹی عورت جلدی کمرے سے برآمد ہوئی۔

"تمینہ اور ثمینہ کہاں ہیں؟"

"تم کون ہو پوچھنے والی۔" اس نے نخوت سے پوچھا۔

"سومل گوہر۔" وہ طیش سے بولی "فوراً" دونوں لڑکیاں میرے حوالے کرو۔"

"جی سی جی!" وہ برابر والی کمرے کی طرف بڑھی۔

"کیوں آئی ہو تم یہاں؟" گوہر طوفانی انداز میں اندر داخل ہوا اور غصے سے چیختے ہوئے پوچھنے لگا۔

"اس لیے کہ میرے اسکول کی لڑکیاں ہیں یہاں پر۔" اس نے پلٹ کر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تمہیں شرم نہیں آئی یہاں آکر میری عزت خاک میں ملاتے۔"

"میرا یہاں آنا" لوگوں کا صرف نظر اٹھا کے مجھے دیکھنا بھی تمہیں گوارا نہیں اور تم جو اپنے گاؤں کی بچیوں کی عزت ملیامیٹ کر رہے ہو۔ تمہیں شرم آتی ہے؟"

"بند کرو اپنی بکواس اور نکل جاؤ یہاں سے۔"

"نہیں جاؤں گی جب تک تمینہ اور ثمینہ میرے حوالے نہیں کرو گے۔"

"کیسے نہیں جاؤ گی تمہارا تو باپ بھی جائے گا۔" اس کا بھاری ہاتھ اس کے نازک رخسار پر نشان چھوڑ گیا۔

اتنی تذلیل اتنی ہتک۔۔۔ وہ نوکروں کے سامنے مار کھا رہی تھی۔

"درندے ظالم! لڑکیاں واپس کرو۔" وہ چیخی گوہر نے بازو سے پکڑ کر اسے گھسیٹا اور ہٹ کے دروازے کے قریب کھڑی پراڈو میں ڈالا۔ اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

آج احساس ہوا کہ عورت کتنی ہی طاقت ور ہو جائے مگر مرد کے آگے مجبور ہی رہتی ہے۔

چاہے کھیت میں کام کرنے والی بے اختیار عورت ہو۔ یا وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھنے والی بااختیار عورت مردوں کا معاشرہ کہیں نہ کہیں اسے بے بس ضرور بنا تا ہے۔

والے گھسیٹتا ہوا حویلی چھوڑ گیا قدم باہر نہ نکالنے کے احکامات جاری کر کے۔

☼ ☼ ☼

کڑی دھوپ کا احساس قوی ہوا۔ ٹھنڈی چھاؤں اب میسر نہ ہو گی سائے لگتا بھیلوں کی یا بہ زنجیر غلامی اس کا مقدر ہو گئی ہے۔ وہ لب سانسوں کا بیگار بھر رہی تھی۔

اس نے بیڈ کے نیچے سے اپنا خفیہ لیپ ٹاپ نکالا۔ خود پر بیتی روداں کو ای میل کر رہی تھی اس نے ہدایت لکھی۔

اس کا دروازہ بجنے لگا۔

اس نے فوراً لیپ ٹاپ بند کر کے بیڈ کے نیچے چھپایا۔ دروازے پر اس کی ساس کھڑی تھیں۔

"اماں آپ؟" وہ حیران ہوئی۔ "اندر آجائیں۔" اس نے راستہ دیا۔

بہو سے کبھی ان کی نہیں بنی نہ ہی سومل ان سے زیادہ بات چیت کرتی مگر کل کے واقعے کے بعد سومل سے ان کو ہمدردی محسوس ہوئی۔ وہ شہری آزاد عورت انہیں اپنی طرح ہی مجبور لگی اس کے چہرے کا داغ انہیں دکھی کر رہا تھا۔

پہلی بار اسے گلے لگا کر پیشانی چومی اور مڑا تڑا کاغذ نکال کر اس کو تھمایا۔

"یہ شہیار کا نمبر ہے۔ تم میری اس سے بات کراؤ گی۔"

"شہیار کون؟" وہ حیرت سے گویا ہوئی۔

"میرا بیٹا جسے سردار نے پسند کی شادی کرنے پر عاق کر دیا تھا" وہ بھی بالکل تمہاری طرح کی باتیں کرتا تھا۔ بڑے سردار نے بالآخر اسے گھر سے نکال دیا۔ کراچی میں رہتا ہے۔ بینک میں ملازمت کرتا ہے۔ گوہر سے تمہاری شادی پر سردار نے اس خوف کی وجہ سے اعتراض نہ کیا کہ کہیں وہ بھی شہیار کی طرح ضد میں آجائے اور دوسرا بیٹا بھی گنوا دے۔"

وہ آہستہ آہستہ حقیقت سے پردہ اٹھا رہی

نہیں۔

"گوہر نے تو کبھی مجھے نہیں بتایا۔"

"کیسے بتاتا سردار نے جو منع کیا تھا۔"

اسے اپنی ساس پر بے تحاشا رحم آیا اس کی ممتا کی تڑپ" آنکھوں کا خالی پن اور عمر قید جس نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔

"مجھے آج لگا ہے۔ تم بھی میری طرح ہی ہو "تب ہی تم پر اعتبار کر کے نمبر دیا ہے۔ تمہارے پاس فون ہے ناں تم میری اس سے بات کروا دو۔ وہ مجھے فون کرتا تھا مگر سردار نے فون کٹوا دیا۔ اس نے موبائل بھیجا" وہ بھی سردار کے ہاتھ لگ گیا۔ پورے دو سالوں سے میں نے اس کی آواز نہیں سنی۔ تم۔ تم مجھے سنواؤ گی ناں اس کی آواز۔"

وہ بے ساختہ رو پڑیں۔

"ہاں کیوں نہیں اماں! آپ مجھے پہلے ہی کہتیں کیوں تڑپتی رہیں میں کسی کو بھی نہیں بتاتی۔ میں بھی تو آپ کی طرح عورت ہوں۔ آپ کا دکھ سمجھ سکتی ہوں۔" اس نے سیل فون اٹھا کر نمبر ملایا اور ان کو دیا۔

"ہیلو۔۔ ہیلو میرا شہیار میرا بیٹا!" وہ روتے ہوئے بے ربط جملے بولتی رہیں۔

"اماں کیسی ہو۔ کس کے فون سے بات کر رہی ہو۔" وہ بے تابی سے خوش ہوتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"بیٹا! تیری بھابھی کے فون سے۔ تو بتا کیسا ہے۔ تیری بیوی ٹھیک ہے؟"

"ہاں! شکر ہے اللہ کا" دعا ہے آپ کی۔"

"بس بیٹا! تیری بہت فکر رہتی ہے۔ سوچتی ہوں پتا نہیں کہاں کہاں روزی روٹی کے لیے دھکے کھا رہا ہے۔ پتا نہیں گزارا کس طرح ہوتا ہو گا۔ ظالم نے اپنی جائیداد سے بھی تجھے عاق کر دیا اور میری جائیداد سے بھی حصہ نہیں دیا۔"

وہ روہانسی ہو کر رو پڑیں۔

"اماں! فکر نہ کرو میں بہت خوش ہوں اور گزارا بھی بہت اچھا ہو رہا ہے۔ کم از کم ضمیر پر بوجھ تو نہیں کہ مظلوموں کا خون چوس کر عیش کر رہا ہوں۔ بہت مطمئن ہوں" آپ بھی خوش رہا کریں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولتا رہا۔

"اللہ سائیں کا شکر ہے تو خوش ہے ورنہ مجھے تو بس تیرا غم کھائے جا رہا ہے۔"

"بس اماں صرف آپ کی دعائیں چاہئیں۔"

فون بند ہو گیا اس نے سومل کو گلے لگا لیا۔

"اللہ تجھے خوش رکھے بیٹا! میرے دل میں ٹھنڈ پڑ گئی۔" وہ دل پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دیتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا آپ اپنی ماں سے ملاقات کے لیے نہیں آسکتے۔ وہ آپ کے لیے تڑپتی ہیں۔" اس نے شہیار کو رات ایک بجے فون کیا۔

"نہیں آسکتا بھابھی! ایک بار ایسی جرأت کی تھی۔ میں تو وہاں سے نکل آیا مگر بابا اسلام آباد سے واپس آئے تو ان کے جاسوسوں نے بتا دیا اور پھر میری ماں نے اس عمر میں مار کھائی۔ میں اپنی ماں کو اس عمر میں بے عزت ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔" وہ بستر سے اٹھ کر گیلری میں آکھڑا ہوا مبادا اس کی بیوی کی آنکھ نہ کھل جائے۔

"کیا آپ کا جرم پوچھ سکتی ہوں؟"

"ہاں پسند کی شادی۔"

"تو پھر گوہر کو اجازت کیسے ملی؟"

"اس لیے کہ بابا کو ایک وارث تو لازمی چاہیے تھا" سو اس کی مرضی بھی رکھنی تھی" دوسرا وہ بابا پر گیا تھا" بظاہر انقلابی مگر اندر سے بابا جیسا سخت سردار یہ حقیقت بابا جان گئے تھے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا شہیار کہ تم گوہر سے کیسے مختلف ہو پسند کی شادی تو ہم نے بھی کی" مگر انجام تمہارے سامنے ہے۔" اس کے لہجے میں دکھ کرلانے لگے۔

"بھابھی! ہماری منگنی کے بعد بابا کے بھیجے غنڈوں نے سارہ کو قتل کرنے کی کوشش کی" مگر اتفاق سے

گولیاں اس کی ماں کو لگیں اور ان کی فوتگی ہو گئی۔ اس خوف اور دہشت نے اس کو ذہنی مریضہ بنا دیا۔ اب بھی کبھی کبھار اس کو دورے پڑتے ہیں۔ زندگی کا یہ ادھورا پن اسے میری محبت کی سزا کے طور پر ملا ہے۔ یہ سزا مجھے اس کے ساتھ بھگتنا ہے ساری عمر کیونکہ میں اس سے بے تحاشا محبت کرتا ہوں۔" وہ محبت سے چور لہجے میں بولا۔

"میری دلی دعا ہے کہ خدا تمہاری محبت قائم رکھے۔" اس نے کروٹ بدل کر ٹھنڈی سانس لی۔

"آپ کو میری ماں کی ساری مسائل مل چکی ہیں۔" اس نے بمشکل لہجے کو دکھ کے بوجھ سے آزاد کر کے نارمل بنانے کی سعی کی۔

"ہاں بھابھی! مجھے بے تحاشا دکھ ہوا آپ کی محبت کی ناکامی پر مگر ساتھ ساتھ خوشی بھی ہوئی مقصد کے حصول اور ہمت پر۔ میں واقعی آپ کو سلام پیش کرتا ہوں۔"

"مجھے تمہارے سلام کی نہیں مدد کی ضرورت ہے۔ چند دن سے اسکول بند ہے۔ میرا باہر نکلنا منع ہے۔ عائشہ کا اندر آنا منع ہے۔ فون پر رابطہ ہے۔ ابھی تمینہ اور ثمینہ گھر نہیں لوٹیں۔ دل ہر وقت پریشان رہتا ہے۔ عائشہ کا سسر ہو بیٹے سے کہتا ہے "تم نکل جاؤ یہاں پیچھے جو ہو گا ہم بھگت لیں گے۔" ظلم کے عادی ہیں۔ ہماری پروا نہ کرو' مگر وہ دونوں نہیں مانتے۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"میرے خیال سے ان کے سسر ان کو صحیح مشورہ دے رہے ہیں۔"

"کیا تم میرا ساتھ دے سکتے ہو شہوار؟"

"بھابھی! بہت مشکل ہے۔ میں ان کو چھوڑ کر وہاں نہیں آسکتا۔"

"اچھا بھائی! کوئی بات نہیں۔" وہ دھیمے سے ہنسی "پتا نہیں موبائل کتنے وقت ساتھ رہتا ہے۔"

اس نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ مستقبل کے اندیشے' واہمے' وسوسے' پھن نکال کے ڈستے رہے۔ وہ صرف خدا کی ذات پر بھروسا توکل کیے ہوئے تھی۔

✿ ✿ ✿

پتا چلا کہ گوہر مہمانوں کے ساتھ کوہستان اور تھر کے دورے پر گیا ہے۔ جہاں نایاب نسل کے پرندے اور جانور۔۔۔ شکار کیے جاتے ہیں۔ ان کچھ دنوں میں اس کی ساس اس کے انتہائی قریب آچکی تھیں۔ اس کی رازدار سہیلی بن گئی تھیں۔ عائشہ کا فون آیا تو وہ اس کے پاس بیٹھی تھیں۔

"میں ہر حال میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں مومل بی بی!"

"مگر کیسے عائشہ! باہر گوہر نے گارڈ کھڑے کر رکھے ہیں۔ گیٹ پر تالا ہے کوئی اندر نہیں آسکتا۔"

"مومل بی بی! میں آرہی ہوں آپ کی طرف۔" اس نے سر جھٹک کر ایک عزم سے کہا۔

"میں گیٹ کھلوانے کی کوشش کرتی ہوں۔" وہ بھی تیزی سے گیٹ پر آئی۔

"دلی نواز! گیٹ کھولو۔" وہ پرانے چوکیدار کو آوازیں دینے لگی۔

"دلی نواز! میں تمہیں حکم دیتی ہوں' تالا کھولنے کا۔" اس کی ساس اس کے پاس آکر غصے سے بولی۔

"بڑی سائیں! میں مجبور ہوں' بڑے اور چھوٹے سردار کا حکم ہے کہ حویلی کے اندر کوئی انسان تو کیا کوئی پرندہ بھی داخل نہیں ہونا چاہیے۔ نہ ہی کسی کو باہر نکلنے دینا ہے۔ جب تک وہ نہ آجائیں۔" وہ عاجز لہجے میں بولا۔

"میں تمہیں پھر بھی حکم دیتی ہوں کہ دروازہ کھول کر عائشہ کو اندر آنے دو۔"

"بڑی سائیں! سردار نے چار نئے گارڈ کھڑے کر دیے ہیں۔ میں جیسے ہی تالا کھولوں گا' وہ مجھے گولی ماردیں گے۔" وہ گیٹ کے دوسری طرف سے کانپتے ہوئے بولا۔

ایک گارڈ نے سردار سے فون پر رابطہ کیا پھر ملنے والی ہدایات پر عائشہ سے موبائل چھینا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔

"اگر پانچ منٹ کے اندر یہاں سے نہ گئی تو گولی ماردوں گا۔"

وہ لوٹ گئی۔ گھر جا کر اس نے مشہد کے فون سے فون کیا "کل صبح میں ہر حال میں اسکول کھولوں گی۔ لوگوں کا خوف دور کرنے کے لیے اس سے بہتر کوئی حل نہیں۔"

"خیال سے عائشہ! اب بات پہلے والی نہیں' ہماری زندگی کی شاخیں برہنہ ہیں جن پر اب کوئی سائبان نہیں' کوئی سبزہ نہیں۔ ہم دھوپ میں کھڑے ہیں۔"

"ہمارا مقصد نیک اور یقین کامل ہے۔ ہم باطل نہیں۔ حق کی صفوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ حق کبھی جھکنے اور بکنے نہیں دیتا۔" اس کی آواز بھی بھرا گئی۔

"میں تمہیں اللہ سائیں کے حوالے کرتی ہوں' عائشہ!"

"اور میں بھی آپ کو اللہ کی امان میں دیتی ہوں مومل بی بی!"

✿ ✿ ✿

اس رات ہوائیں بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ ہواؤں کی لے پُر سوز تھی۔ فضا پر ان دیکھا سوگ طاری تھا۔ رات اس کی آنکھوں میں سرکتی۔ بار بار نم آنکھوں سے کروٹ بدل کر مشہد کو دیکھتی جس کے چہرے پر نیند میں بھی پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

مومل کی نظر بندی کے بعد سے وہ بے حد متفکر رہنے لگا تھا۔ شام سے اس کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا جب عائشہ کو مومل سے ملنے نہیں دیا گیا اور عائشہ نے آج صبح ہر حال میں اسکول کھولنے کا فیصلہ سنایا تھا۔ مشہد کو بہت دیر میں نیند آئی تھی مگر اس کی آنکھوں سے تو نیند نے بہت دور جا کر بسیرا کیا۔ وہ کھلی آنکھیں اس پر گاڑے چند گھنٹوں بعد درپیش حالات کو سوچتی رہی۔

پو پھٹی صبح بے کل رات کے دہانے سے نمودار ہوئی۔ اس کا سسر بھینس دوہنے لگا۔ ساس نماز پڑھ کر رات کے بچے کھچے روٹی کے ٹکڑے پرندوں کے آگے ڈال کر چولہا جلانے میں مصروف تھی۔ اس نے سستی سے کروٹ لے کر دوسری چارپائی پر اپنے سوئے ہوئے بچے کو دیکھا۔

"کیا میرے بچے کا مستقبل اندھیر ہے۔" وہ بھی غلامی کی جہالت کی زندگی گزارے گا؟ نہیں۔ میں نے اسے آزاد پیدا کیا ہے۔ کوئی اسے غلام نہیں بنا سکتا۔" شدید غصہ رگ و پے میں بھر گیا۔ اس نے جھک کر اسے چوما اور بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

"بچے کی نیند کیوں خراب کر رہی ہو؟" چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکائے۔۔۔ بیٹھے مشہد نے متبسم ہو کر کہا۔

"سنو اسے کبھی غلام نہیں بننے دینا۔" وہ بے تابی سے اٹھ کر اس کے پاس آکھڑی ہوئی۔

"ہم دونوں اپنی نسل کو غلامی سے بچائیں گے۔ چاہے کبھی جنگ کیوں نہ لڑنی پڑے۔" مشہد کے مضبوط لہجے نے اس کی ہمت میں اضافہ کر دیا۔

"ہاں' چاہے ہمیں کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔"

آج اس کو اپنی کیفیت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ناشتہ کرتے ہوئے ایک بے کلی سی گردش کر رہی تھی۔ وہ نہا کر سبز رنگ کا سوٹ پہن کر آئی۔

"سدا سہاگن ہری بھری رہو۔" اس کی ساس نے پیار سے دعا دی۔ اس نے مشہد کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر آمین کہا۔

الماری سے اسکول کی چابیاں نکال کر پرس میں ڈالیں اور گھر گھر جا کر بچوں کو نکالا کچھ ساتھ آئے' کچھ کو ان کی خوف زدہ ماؤں نے نہیں چھوڑا۔ وہ بیس پچیس بچوں کو لے کر آئی جن میں زیادہ تر لڑکے تھے۔ ان کو غنیمت جانا اور تالا کھول کر پڑھانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں سردار کا کمدار آیا۔

"سردار کی فارم والی زمین پر ٹریکٹر لے کر پہنچ جاؤ"

ہل چلاتا ہے۔ سردار اس میں گندم کے نئے بیج کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں۔" منشھار اس کے ساتھ آیا تھا۔

"ہم چلو تمہیں چند گھنٹوں میں آجاؤں گا۔" وہ عائشہ کو اسکول میں تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

"تم چلے جاؤ منشھار! جیسے یہ تین گھنٹے خیر و خوبی گزر گئے ویسے دو گھنٹے بھی گزر جائیں گے۔" عائشہ نے اسے دلاسا دیا۔

"ہاں۔ ہاں منشھار! بھابی کا کوئی بھی نام نہیں لے گا۔ تم بے فکر رہو۔" کمہار نے اسے یقین دلایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے وہاں سے اٹھنا پڑا۔

"اپنا خیال رکھنا۔" اس نے سرگوشی کی۔

"بے فکر رہو۔" عائشہ نے اثبات میں سرہلا کر جواب دیا۔ پھر دو گھنٹے بھی خیریت سے گزر گئے۔ وہ خوش تھی۔ بچوں کو چھٹی دے کر کلاس روم کو تالا لگایا اور حویلی گیٹ پر آگئی۔

اسی وقت دو نقاب پوش افراد اس کے سامنے آگئے اور ہتھیاروں کے منہ اس پر کھول دیے۔

فائرنگ کی آواز پر پرندے درختوں سے چیخیں مار کر اڑنے لگے۔

کھیتوں میں کام کرنے والے ہاری، راہگیر، دکان دار نادانستہ اسکول کی طرف بھاگے، جہاں خون میں لت پت عائشہ زندگی سے منہ موڑ کر بغاوت کے لہو کا تحفہ سجائے زمین پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ خالق حقیقی کو سجدے میں اپنی فریاد سناتے دم توڑ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک دم شور اٹھا۔ وہ گھبرا کر باہر نکلی۔

"یاالٰہی خیر کیا ہوا اماں؟"

"پتا نہیں بیٹا میرا دل گھبرا رہا ہے۔" باہر رونے کی آوازیں آرہی ہیں۔

آہستہ آہستہ سب گیٹ کے پاس جمع ہو گئیں۔

"گلشن! تم گیٹ کے اوپر سے جھانک کر دیکھو کیا ماجرا ہے۔"

"نا چھوٹی بی بی! چھوٹے سردار کی حکم عدولی نہیں کر سکتی۔" وہ آنکھیں گھما کر پراندہ جھلاتے بولی۔

"ماسی! تم اوپر چڑھ کر دیکھو۔"

"بی بی جی! کہیں چوکیدار مجھے گولی نہ مار دے۔" وہ ڈرتے ہوئے بولی۔

"کوئی نہیں مارتا تمہیں گولی، اسٹول لاؤ میں خود دیکھتی ہوں۔" وہ غصے سے اسٹول پر چڑھ گئی۔

دنیا کا میلہ ہو۔ یا قبر کا اندھیرا تنہائی انسان کی ذات سے منسلک ہے۔ شاید اس لیے کہ خالق خود تنہا ہے۔ اور مخلوق کے اندر بھی تنہائی کا احساس رکھ دیا ہے۔

اس تنہائی سے بھاگنے کے لیے انسان جیون بھر دوڑ دھوپ کرتا ہے۔ رشتے نبھاتا ہے۔ دوست بناتا ہے فریب زندگی میں مبتلا رہتا ہے۔ مگر تنہا ہی دنیا سے اٹھا لیا جاتا ہے۔

سامنے کے منظر نے چند لمحوں کے لیے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفلوج کردی۔

"میں نہیں چھوڑوں گا ان سرداروں کو جنہوں نے میرا گھر اجاڑا ہے۔ میرے بچے کو یتیم کیا ہے۔ میری محبت مجھ سے چھین لی۔" منشھار روتے ہوئے چیخ رہا تھا۔

"اب نہیں جھکیں گے ہم ان سرداروں کے آگے بس کرچکے غلامی ان بھیڑیوں کی، جو گوٹھ کی عزتوں کو پامال کرتے ہیں۔ بولنے والوں کی زبانیں ہمیشہ کے لیے خاموش کروادیتے ہیں۔ اب ہم چپ نہیں رہیں گے۔ کتنوں کو مارے گا وڈیرا! کیا پورے گاؤں کا قتل عام کردے گا۔"

گاؤں کے لوگوں کے غم و غصہ سے قطع نظر وہ غم کے دریا میں ڈوب رہی تھی۔ آنسو اس کے گالوں پر قطار در قطار بہہ رہے تھے۔

اسی وقت منشھار نے سر اٹھا کر — روتی ہوئی مومل کو دیکھا۔

"دیکھو بی بی! دیکھو تمہارے تبدیلی کے خواب لاش پڑی ہے۔"

کٹتے ہوئے وہ یوں چیخ کر رو دیا جیسے دو بچھڑے ہوئے درد مشترک پر روتے ہیں۔

آگے بڑھ کر اس نے عائشہ کے منہ سے کپڑا ہٹایا اور خود چارپائی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ مومل کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔ نفرت و غصے کی شدید لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کرگئی۔

"تم اس حد تک گر سکتے ہو گوہر! مجھے اندازہ نہیں تھا۔"

اسی وقت گارڈز نے ہوائی فائرنگ کردی۔ مجمع منتشر ہونے لگا۔ چند لوگوں نے چارپائی اٹھائی اور کمہاروں کے گھر کے راستے پر چل دیے۔ ایک آدمی منشھار کو سہارا دے کر لے جانے لگا۔

عائشہ کا لہو رنگ چہرہ اس کے تصور سے چپک گیا۔ حویلی میں اس دن نہ کسی نے کھانا کھایا نہ پکایا۔ سارا دن افسردہ، بے کلی سے گزرا۔ رات کو اس کی ساس چائے بنوا کر اس کے کمرے میں آگئیں۔

"اماں مومل! چائے پی لے۔ رو رو کر سر درد ہو گیا ہوگا۔" وہ اس کے ساتھ بیٹھ گئیں۔

"اماں! میں نے سوچا تھا کہ گوہر ہیرا ہے مگر وہ تو پتھر نکلا۔" دکھ اس کے لہجے کے زیروبم میں اتر گیا۔

"ہاں مومل دھی! تھا تو وہ واقعی ہیرا مگر جوہری کے بجائے لوہار کے ہاتھ لگ گیا، جس نے اسے چمکانے کے بجائے سیاہ کردیا۔ اس میں اس کا قصور نہیں ہے اس کے باپ کے رعب و داب جاگیر و جائیداد کا قصور ہے۔ وہ لالچی بن کر انسانیت سے گر گیا ہے۔ ورنہ پہلے شہر سے اس کے خیالات بہت نئے تھے۔" وہ گہری دکھ بھرے سانس لیتے ہوئے بولیں۔

"تب ہی تو میں بھی دھوکہ کھا گئی۔ گھن آتی ہے مجھے اس زندگی سے، جو ظالم کی ہم سفری میں گزری ہے۔ شرمندہ ہوں میں اپنے آپ سے اپنے محبت کے جذبے سے۔" چائے کا گھونٹ اس کے حلق میں پھنس گیا۔ "اماں! اب میں گوہر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔" وہ رو پڑی۔

"نا بیٹا نا۔ ایسی بات پھر منہ سے نہ نکالنا۔ اگر اس کی بیوی رہیں تو زندہ بھی رہو گی، ورنہ پتا نہیں وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کرے۔" خوف ان کے چہرے سے عیاں تھا۔

"تو کیا وہ مجھے قتل کردے گا؟" اس نے بے خوف لہجے میں پوچھا۔

"سردار سانپ کی مثل ہوتے ہیں، جو اپنے ہی بچے کھا جاتے ہیں۔"

"مگر میں کسی سے نہیں ڈروں گی، سوائے اس ذات پاک کے جس کے آگے روز قیامت مجھے جواب دہ ہونا ہے۔" وہ نڈرپن سے گویا ہوئی۔

"تجھے نہیں پتا مومل! ان دیواروں میں کئی انار کلیاں چنوادی گئیں۔ کنوئیں کے اندر موت کے نشان بھی گم کر بیٹھیں تو کسی کو عمر قید کی کال کوٹھڑی کی خوراک بنا دیا گیا۔ تو کیا سمجھتی ہے، اس حویلی میں صرف میں اکیلی ہی تھی؟ نہیں۔ مجھے تو تنہا کردیا گیا۔ اور سب کو لمبی نیند سلا دیا گیا۔ نہ جنازہ نہ فاتحہ نہ ہی کانوں کان کسی کو خبر ہوئی۔ نہ کسی کو پوچھنے کی ہمت ہوئی۔ تو بھی کوئی ایسی غلطی نہ کرنا مومل! اگر تیرا بچا دیواروں سے پوچھنا پڑے۔ مت کرنا احتجاج۔ کوئی بحث نہیں، خاموش رہنا۔ اور خاموشی کو ہی اپنا احتجاج بنائے رکھنا۔"

وہ ساری حقیقت بیان کرکے بعد میں امڈتی یادوں سے نڈھال ہو کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

گوہر نے آتے ہی گھر میں بھونچال مچادیا۔

"تصاون! سارا فساد تمہارا پھیلایا ہوا ہے۔ تم نے باغی کیا ہے لوگوں کو، ورنہ ان کمین کی کیا ہمت کہ بغاوت پر اتر آئیں۔ صدیاں گزر گئیں کبھی کوئی ہمارے خلاف تھانے میں رپورٹ درج کرانے نہیں گیا۔ اس کمہار کی یہ ہمت کہ ہم پر فریادی بن جائے۔"

"تو تو اس کا شوہر ہے گوہر! مگر عائشہ کے قتل یہ تو

میں بھی عمر بھر تمہیں معاف نہیں کروں گی۔" گوہر کے طیش اور عائشہ کی یاد نے اس کی گوہر سے نہ لڑنے کی مصلحت پر پانی پھیر دیا۔

"تم... تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟" وہ تمسخر سے ہنسنے لگا۔ "حیثیت کیا ہے تمہاری۔ میں تمہاری معافی کا محتاج نہیں۔ میں سردار گوہر علی خان ہوں' تمہارا کوئی کمی نہیں۔" اس نے اسے بالوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"میں تمہاری عزت ہوں گوہر! سب کے سامنے یوں بے عزت نہ کرو۔" وہ ہتک کے احساس سے رو پڑی۔

"عزت؟ وہ عزت جو کمی کمین کے گھروں میں جاتی ہے۔ فارم ہاؤس پر سینکڑوں ملازموں کے سامنے مجھے ذلیل کرنے آتی ہے۔ چھوڑا کیا ہے تم نے مجھ میں' سارے گاؤں میں بدنام ہو گیا ہوں میں۔" چبا چبا کر بولا۔

"گوہر! تم مجھ سے محبت کے دعوے دار تھے۔" اس نے ہچکی لی۔

"ہاں تم سے۔ مگر تمہاری اوٹ پٹانگ حرکتوں اور تمہارے غلیظ نظریوں سے نہیں۔" اس کا طیش اور سوا ہوا۔

"یہ آپ کی محبت کا مان ہی تھا' جو مجھ سے سب کچھ کروا رہا تھا۔" وہ روتے روتے بولی۔

"نہیں۔ یہ میری ڈھیل تھی جس کی وجہ سے تم نے یہ ہمت کی کہ میرے ساتھ' میرے باپ کے ساتھ بغاوت کی۔ ہمارے نظام کے خلاف بغاوت کی۔ اکسایا دو ٹکے کے لوگوں کو ہمارے خلاف۔ اگر میں چاہتا تو اس جرم میں تمہیں قتل بھی کروا سکتا تھا مگر۔" وہ سخت غصے میں دانت پیس کر بولا۔

"مول مہر! یہ مت سمجھنا کہ تمہاری محبت میں تمہیں چھوڑا ہے۔ جب میرے نام' دولت و طاقت کے بغیر دنیا سے ٹکراؤ گی تو تمہیں اپنی اصلیت کا علم ہو جائے گا۔ میں تمہیں زندہ چھوڑ کر صرف اس لیے دنیا کی ٹھوکروں میں رکھنا چاہتا ہوں تاکہ تم اپنی انفرادی حیثیت پہچان سکو۔"

"مجھے چھوڑو گوہر!" دونوں ہاتھ پیچھے کر کے اس نے اپنے بال چھڑانے کی سعی کی۔

اس کی گرفت مزاحمت پر اور مضبوط ہوئی۔

"اس لیے میں تمہیں اپنی زندگی سے نکالتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں مول مہر! طلاق دیتا ہوں۔ طلاق دیتا ہوں۔"

"نہیں گوہر نہیں۔" تیزی سے اٹھ کر آنے والی اس کی ساس بے ساختہ چلائیں۔ "بیٹا! خدا کے لیے اپنا گھر نہ اجاڑو۔"

"اماں! یہ گھر میں رہی تو ہمارے رسم و رواج' سرداری' بادشاہی پگ' سب کچھ چھین لے گی' سب اجڑ جائے گا۔ اسی لیے یہ آج سے میری بیوی نہیں ہے۔ باندی ہے۔" وہ اسے بازو سے گھسیٹ کر باہر لے جانے لگا۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لیے۔ خدا کا واسطہ گوہر! اسے کہیں مت لے جاؤ۔"

"اماں! یہ آزاد چھوڑنے کے قابل نہیں ہے۔ یہ آزاد رہی تو ہمیں اندر کروا دے گی۔" وہ پیچ و تاب کھاتے بولا۔

"دیکھ میں تجھے اپنا دودھ نہیں بخشوں گی' اگر تو نے اسے فارم ہاؤس پر قید کیا تو۔" وہ چٹان بن کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔ گوہر نے اس کا موبائل اٹھایا۔

لیپ ٹاپ اٹھا کر دروازے کو باہر سے لاک لگایا۔ "گلشن او گلشن!"

وہ اس کی پکار پر دوڑتی آئی۔

"کھانا دینے جانے کے علاوہ کوئی بھی اس کمرے میں نہیں جائے گا' نہ ہی یہ کمرے سے باہر آئے گی۔"

وہ گلشن کو چوکیداری سونپ کر خود اسی تکبر سے چلتا ہوا باہر کی طرف نکل گیا۔ گھر کی ملازماؤں کو ملال نے آ گھیرا۔

ایک گلشن تھی جسے کوئی رنج و فکر نہ تھی۔ اس کا تو

جیسے راستہ صاف ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"سردار گوہر! تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ بے وقوف بنا کر ذلیل و خوار کیا ہے۔" وہ روتے روتے نڈھال ہو گئی۔ پیاس سے گلا خشک ہوا تو اٹھ کر فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی۔ حلق تر ہونے کے بعد وہ قریب پڑی کرسی پر ٹک گئی۔ اس کا گلنار چہرہ ان تین دنوں میں کملا کر زرد ہو گیا تھا۔

"مول میرے تجربے ناکامی اور تنہائی سے سبق حاصل کر لینا بیٹا۔"

ماں کے الفاظ دل کے گنبد سے ٹکراتے رہے۔ کتنے مان سے اس نے جواب دیا تھا۔ "اماں! کوئی کسی کے تجربے میں شامل نہیں ہوتا۔ مجھے یہ تجربے خود کر لینے دیں۔"

اور اب تجربہ کرنے کے بعد وہ تہی داماں تھی۔ تنہا تھی اور شاید ہر انسان اپنی ذات میں تنہا ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے کمرے میں تھی' ملازمہ دودھ ٹیبل پر چھوڑ گئی۔ سونے سے پہلے عادتاً اس نے دودھ کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگایا تھا۔ پورا گلاس پی گئی۔ دودھ حلق سے اترنے کے ساتھ ہی اسے چکر آ گیا۔ کیا اس میں نشہ تھا۔ اس سوچ کے ساتھ اس کو قے آ گئی۔ وہ لڑکھڑاتی واش روم کی طرف بڑھی۔

الٹی کرنے کے بعد کلی کر کے وہ بند ہوتی آنکھوں سے بمشکل گھسیٹ کر بیڈ تک پہنچی۔ وہ بے ہوش نہیں ہونا چاہتی تھی۔ مگر بیڈ پر لیٹنے سے پہلے ہی بیڈ کی سائیڈ پر نیچے گر گئی۔ اس نے آنکھیں گھما کر ارد گرد کا منظر دیکھا۔

کالے پانی کی اسیر عورتیں موجود تھیں۔ نظر سامنے اٹھی تو سلاخیں نظر آئیں۔

سردار کی محبت کا انجام آخر جیل خانہ تھا۔

اب آزادی کا کوئی آسرا نہ تھا۔ اس کال کوٹھڑی

میں آئے اسے چار دن ہوئے تھے کہ وہ موٹی عورت اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"تو لڑکی! تیرا بلاوا ہے۔"

وہ قیدی تھی جسے بولنے کا کوئی حق نہ تھا۔ وہ اسیر زنداں سے نکل کر اس موٹی وحشی عورت کی معیت میں اس کمرے تک آئی جہاں محبت کے راج کو تاراج کرنے والا اس کا سابقہ شوہر نشے میں مست صوفے پر لیٹا ہوا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر طنزیہ مسکرایا۔

"کیوں تبدیلی کی علمبردار ہو گیا شوق پورا۔" تمسخرانہ لہجے میں پوچھا۔

"اب پتا چلا ہماری طاقت کا؟" وہ کہتے اٹھا۔ "ہم چاہیں تو سر کا تاج بنا دیں۔ بگڑیں تو پیر کی جوتی۔" اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے بڑے تفاخر سے بولا۔

اس نے دھندلی آنکھوں سے اس کے مسکراتے متکبر چہرے کو دیکھا اور پھر اپنے دل کو، جو مرگ محبت پر سیاہ حزن میں ملبوس سوز خوانی میں مصروف تھا۔

وہ اک ہی دھکے پر بیڈ پر چاروں شانے چت ہوئی۔ گوہر کی آنکھوں میں ہوس دیکھ کر اس کی گنگ زبان کھلی۔

"تم اب میرے لیے نامحرم ہو۔"

"تم میری باندی ہو اور باندی کے لیے کوئی محرم نامحرم نہیں ہوتا۔ باندی صرف باندی ہوتی ہے۔" زہریلی ہنسی ہنس کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھا۔ وہ قفس میں پھڑپھڑا کر بے دم ہوئی۔ وہ کرب کے اک عجیب سفر سے گزری۔

☼ ☼ ☼

"کیا آپ اب بھی اس کی مدد نہیں کریں گے؟" تحفہ سراپا سوال بن کر شہریار کے سامنے کھڑی تھی۔

مومل کی ماں آکر اس کو سارے حالات سے آگاہ کر گئی تھی۔ تصدیق کے لیے اس نے اپنی ماں کا سیل نمبر ملایا جو کہ حسب معمول بند تھا۔ اس نے حتی الامکان کوشش کا آسرا دے کر مومل کی ماں کو واپس بھیج دیا اور خود ماتھے پر ہاتھ دھر کے بیٹھ گیا۔

"میں کچھ نہیں کر سکتا، اگر کچھ کر سکتا تو اپنا حق نہ لیتا؟"

مگر چند دن بعد اس کی ماں نے پوشیدہ سیل فون آن کیا۔ اور اس سے مومل کو چھڑانے کی درخواست کر دی۔

ماں کے حکم کے بوجھ نے اسے کمر کس لینے پر مجبور کر دیا۔

اسی شام اس نے اپنے کلاس فیلو ڈی ایس پی کو کھانے پر مدعو کیا۔

ساری بات چیت ڈائننگ ٹیبل پر ہوئی۔

"دو دن بعد ڈی آئی جی کے پاس میٹنگ ہے۔ میں اس علاقے میں اپنے تبادلے کی درخواست دے دیتا ہوں۔" ڈی ایس پی حسن علی نے اپنے جگری یار سے وفاداری نبھانے کو جو کہا وہ کر بھی دکھایا۔

ایک ہفتے کے اندر اس کے پوسٹنگ آرڈر آگئے۔

وہ باپ بیٹا اپنی آدھی وزارت بچانے یا پوری وزارت لینے کی کوشش میں اسلام آباد بھاگے۔ اور اسی رات ڈی ایس پی حسن علی نے شہریار کے ساتھ فارم ہاؤس پر دھاوا بول دیا۔

چاروں جانب پولیس موبائل دیکھ کر فارم ہاؤس کے سیکورٹی گارڈز نے ہتھیار پھینک دیے۔ وہ با آسانی نجی جیل کھول کر سارے قیدیوں کو نکال لائے۔

"مومل مہر کہاں ہے؟" اس نے موٹی عورت سے پوچھا۔

وہ قطار میں کھڑی عورتوں کو چھوڑ کر اک طرف کھڑی حیرت سے اس معجزے کو دیکھتی مومل کی طرف آیا۔

"میں شہریار ہوں۔ آپ میرے ساتھ آجائیں۔"

وہ گاڑی میں آ بیٹھی۔ دوسرے قیدیوں کو پولیس موبائل میں حسن علی تھانے لے گیا۔ جن کو میڈیا کے آگے پیش کر کے حکومتی مشینری پر دباؤ ڈالنا تھا کہ اس کے خلاف کوئی ایکشن نہ لیا جا سکے۔

"بہت دکھ ہوا۔ بھابھی۔" کہتے ہوئے اس نے

زبان کو روکا۔

"سوری مومل! آپ کو اس حال میں دیکھ کر۔"

اس نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شہریار کو دیکھا۔ وہ دکھ سے مسکرائی۔

"آپ کے دل پر محبت کی تحریر سجی تھی۔ جس کے ہر لفظ میں ظاہری و باطنی حسن چھپا تھا۔ بھائی گوہر ہی کور چشم تھا جو نا کچھ پڑھ سکا نہ دیکھ سکا۔ افسوس اس نے آپ کی قدر نہیں کی اور ظلمت کے اندھیرے میں بھٹکتا رہا۔ مجھے اپنے بھائی کی بدنصیبی پر نہایت افسوس ہے۔"

☼ ☼ ☼

وہ جو ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ اس کے لیے مشہور تھا کہ پرندہ بھی اس کے ممنوعہ علاقہ میں پر نہیں مار سکتا، اس کے علاقے میں فارم ہاؤس پر پولیس نے اتنی دیدہ دلیری سے چھاپہ مارا جبکہ وہ حکومتی مشینری کا اہم پرزہ سمجھا جاتا تھا۔ اپنے ہی دور حکومت میں بدنام اور ناکام ہو رہا تھا۔ یہ بات اس کے حلق میں اٹک گئی۔ تھانے دار ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"میرا کوئی قصور نہیں سرکار! اچانک ڈی ایس پی کا آرڈر آگیا اور مجھے تو یہ بھی پتا نہیں تھا یہ ریڈ آپ کے فارم ہاؤس پر کیا گیا ہے۔ مجھے تو اس وقت پتا چلا جب آپ کے صاحبزادے شہریار خان کو گوہر خان کی بیوی کو ساتھ لے جاتے دیکھا۔ ورنہ آپ کو تو پتا ہے میں آپ کا پرانا نمک خوار ہوں۔ آپ کو پہلے ہی اطلاع دے دیتا اگر پتا ہوتا۔" تھانے دار کی گھگھی بندھی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے، یہ بات مخفی رکھی گئی تم سے، مگر فارم ہاؤس پہنچ کر تو اطلاع دے سکتے تھے۔" بڑے سردار مونچھوں کو تاؤ دیتے برہم ہوئے۔

"سائیں! آپ تو بادشاہ ہیں، کیسی باتیں کرتے ہیں، ریڈ اچانک مارا گیا تھا، اس کے سامنے بھلا کیسے میں یا میرے عملے کا کوئی بندہ آپ کو فون کرتا۔ وہ تو فوراً ہمیں لائن حاضر کر دیتا۔" ایس ایچ او عاجزی سے بولا۔

بڑے سردار نے آپے سے باہر ہو کر کرسٹل کی ایش ٹرے اٹھا کر ایل سی ڈی پر دے ماری۔

"ملنگوں نے تو شرفا کا ستیاناس مار دیا ہے۔ جس کی پگڑی چاہیں اچھال دیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں، معززین کو بلا کر دو کوڑی کا کر دیتے ہیں۔"

اسی وقت سیل فون پر گوہر کا نام آنے لگا۔ انہوں نے کال ریسیو کی۔

"شہریار تک پہنچ گیا ہوں، اب اس ڈائن تک بھی پہنچ جاؤں گا۔"

"شاباش میرے دلیر بیٹے! تم سے یہی امید تھی مجھے۔ یہ نالائق، نافرمان بیٹا، پھر بھی اسے پریشرائز کرنا، دیکھنا کوئی الٹی سیدھی گولی نہ چلا بیٹھنا۔"

"بے فکر رہیں بابا! پتا ہے مجھے، وہ بچپن سے آپ کا لاڈلا رہا ہے۔ میرا بھی بھائی ہے، لاکھ شکوے سہی پر جان کبھی بھی نہیں لوں گا اس کی۔" وہ سیدھا شہریار کے بنگلے آیا۔

"تمہیں چھپایا ہے اس منحوس عورت کو؟" وہ اس کی میز پر جھکتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

"مجھے نہیں پتا، اپنی ماں کے پاس ہوگی۔" وہ اس کے طیش کو نظر انداز کر کے بولا۔

"نہیں ہے وہ اپنی ماں کے پاس، اس بڑھیا نے اپنا گھر تبدیل کر لیا ہے۔ تمہیں تو یقیناً پتا ہوگا اس کے ٹھکانے کا۔"

"وہ راستے میں ہی اتر گئی تھی، مجھے نہیں پتا کہاں گئی۔"

"بڑا درد اٹھا تھا اس کا، اسی کی خاطر باپ کو بھی رسوا کروا دیا زمانے بھر میں۔" وہ دانت پیستے بولا۔

"میں قطعاً لاعلم تھا کہ یہ خبر میڈیا پر آجائے گی۔ ہاں اتنا ضرور مانتا ہوں کہ مومل کو چھڑانے کے لیے میں خود گیا تھا۔"

"کیا لگتی تھی تمہاری؟ بیوی میری اور تعلقات..."

"زبان سنبھال کر بات کریں۔" شہریار نے غصے سے بات کاٹی۔ "میں آپ جیسا بے غیرت نہیں، جو

اپنی ہی عزت کو تار تار پھینکوں۔ اس ایسی ہستی کا حکم تھا' جسے میں نہیں ٹال سکتا تھا۔"

"کون ہے وہ ہستی۔"

"جن کے پیروں تلے جنت ہے جائیے آپ کھڑا کیجیے اسے بابا کی بندوق کی نال کے سامنے اور بن جائیے جنونی۔"

"تماں سے رابطہ کیسے ہوا تمہارا؟" وہ کچھ نرم پڑا۔

"آپ کی سابقہ بیوی کی مرہون منت ہے۔ جس کو اگر طلاق دے کر نکال دیتے تو شاید اتنا بڑا اسکینڈل نہ بنتا۔"

"چھوڑ دیتا اس ناگن کو دودھ پلا کر جیتا جاگتا' تاکہ وہ مجھے ڈستی رہے۔"

"محبت کی تھی بھائی جو نبھانا بھی سیکھتے۔" وہ افسوس سے بولا۔

گوہر چند لمحوں تک اسے غصے سے گھورتا رہا۔

"ڈھونڈ نکالوں گا اسے' چاہے زمین کی تہہ میں ہو یا آسمان کی وسعتوں میں۔" وہ چبا چبا کر بولا۔ اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

☼ ☼ ☼

"مجھے تمہارے انجام کا پتا تھا۔ جب ہی گھر چینج کیا۔" وہ اس کو چائے کا کپ تھماتے ہوئے بولی۔

"اب کیا سوچا ہے' کیا یوں ہی اس مرد محبت کا ماتم کرتی رہو گی یا اٹھ کر زندگی میں پھر سے حصہ لو گی؟"

"نہیں اماں۔ مجھے دل کو محبت کے دھوکے سے نکالنے میں کچھ وقت تو چاہیے ناں۔ پھر اتنی جلدی باہر نکلنے سے گوہر کا مجھ تک پہنچنے کا بھی خطرہ ہے۔" اس نے چھوٹے چھوٹے سپ لیتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

"ویسے میں نے تو ال جی این جی او میں جاب کی آفر کو قبول کرلیا ہے۔ وہ عورتوں کے لیے صحت و تعلیم کے لیے کام کررہی ہے۔ ایک مہینے بعد اسلام آباد میں گل پاکستان سیمینار منعقد ہونے والا ہے۔ اس این جی او کی طرف سے میں نمائندگی کرنے جاؤں گی۔"

"خیال سے بیٹا! یوں اسلام آباد جانا اک بڑے سیمینار میں شرکت کرنا خطرے سے خالی نہیں۔" ماں کی آواز تشویش عود کر آئی۔

"فکر نہ کریں اماں! اس بڑی این جی او کا کام بن کر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' جبکہ میرے ماضی سے ہماری این جی او اور انسانی حقوق کمیشن والے واقف ہیں۔ وہاں کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے وہ سو بار سوچے گا۔" وہ پرعزم ہوئی۔

"اللہ تمہیں کامیاب کرے اور ظالموں کے ظلم سے محفوظ رکھے۔" وہ دل سے دعا گو ہوئی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت سوچ سمجھ کر وار کرنا چاہتا تھا۔ میڈیا پر رسوائی اور این جی او کی طرف سے بار بار بیان دینا کہ مومل مرتضیٰ کی جان کو اس کے سابقہ شوہر سے خطرہ ہے۔ وہ اس لیے محفوظ حکمت عملی بنانا چاہتا تھا۔ تاکہ اس پر شک نہ کیا جائے اور لوگ مومل کو بھول جائیں۔ روزانہ ایسی عورتوں کے بیان دیکھ کر لوگ عادی ہوگئے ہیں۔ مومل کو قتل کروانا یا اغوا کروانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

اس نے تین مختلف لوگوں کو اس کو نگرانی پر رکھا ہوا تھا۔ ایک آدمی اس کے فلیٹ والی گلی میں کھوکھا لگا کے بیٹھا تھا۔ دوسرا اس این جی او کے دفتر کے سامنے والی بلڈنگ کا چوکیدار تھا۔ تیسرا اس مین روڈ کی ایک دکان پر بیٹھا رہتا' وہ جب بھی کہیں بھی جاتی تو وہ مناسب فاصلے پر کبھی موٹر سائیکل کبھی گاڑی پر اس کا پیچھا کرتا۔ وہ اس کے لمحے لمحے کی حرکت سے آگاہ رہتا تھا۔ اسے فون پر ساری اطلاعات ملتی رہتیں۔ وہ ہر بات باپ کو بتاتا تھا۔

"آج وہ یونیورسٹی میں صحافی عورتوں پر مقالہ پڑھے گی۔ بہت تیزی سے مقبول ہورہی ہے' اپنے سوشل سرکل میں۔" اس نے پیچ و تاب کھاتے باپ کو بتایا۔

"اگر اس کو پہلے ہی ٹھکانے لگا دیتے تو آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔" بڑے سردار نے بددلی سے کہا۔

"میرا خون کھول رہا ہے بابا! اس وقت کو کوس رہا ہوں جب آپ کا کہنا مانا' سوچا تھا اذیتیں دے دے کر ماروں گا' مگر کم بخت کی قسمت اچھی نکلی ورنہ سالوں ہماری قید سے کوئی پنچھی آزاد نہیں ہوا' مگر یہاں تو گھر کا بھیدی ہی دشمن نکلا۔" وہ چیختا ہوا۔

"خبردار! اس کا نام نہ لینا۔ میں تو باپ کے ساتھ ایک سردار بھی ہوں' شاید برداشت کر جاؤں' مگر تمہاری ماں جیتے جی مر جائے گی۔" انہوں نے فوراً ٹوکا۔

"آپ لوگوں کی وجہ سے ہی تو چھوڑ کر رکھا ہوا ہے۔ ورنہ مومل کے ساتھ اس کی بھی بوٹیاں کرنے کا ارادہ تھا۔" تب ہی فون کی گھنٹی بجی تو گوہر نے اٹھالیا۔ اس کے ایم این اے دوست کا فون تھا۔

"گوہر! جتنی جلد ہو سکے ملک سے باہر نکل جاؤ۔"

"پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔" وہ ہنسا۔ "مذاق وہ بھی اتنا بھیانک۔"

"یار گوہر! یہ مذاق نہیں ہے۔ میں خود لندن کی فلائٹ لے کر نکل رہا ہوں' تم بھی فوراً نکلو' امکان ہے کہ تمہارا ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں نام آجائے۔ بہت جلدی میں ہیں' پھر کہیں گے کسی دوسرے ملک میں۔" اس نے تیزی سے بات کرکے فون بند کردیا۔ گوہر باپ کی طرف گھوما۔

"بابا! مجھے فوری طور پر نکلنا ہوگا۔" اس نے بڑے سردار کو بتا کر فوراً اپنے سیکریٹری کو بلایا۔ "فوراً ایجنسی والے کو فون کرو۔ قطر' ابوظہبی' دبئی' جہاں کی بھی پہلی فلائٹ ملے' سیٹ بک کرواؤ۔"

حکومت جانے کی باتیں تو گردش میں تھیں' مگر اتنا اچانک ہوجائے گا بڑے سردار کو دھچکا لگا۔ رنج میں جائے بھی ختم نہ کیا ہے۔"

"سر! ایجنسی کے مالک کا فون ہے' وہ کہہ رہا ہے شام کی فلائٹ میں سیٹ کنفرم ہوگی۔"

"دو مجھے۔" اس نے سیل فون سیکریٹری سے لے لیا۔ "یار! اتنی پرانی جان پہچان والوں کو فوری فلائٹ کی رعایت تو دینی چاہیے۔ مجھے دو گھنٹے میں جو فلائٹ جارہی ہے اسی میں سیٹ چاہیے۔"

"سردار صاحب دو گھنٹے میں جا تو رہی ہیں' مگر قطر' ابوظہبی کی سیٹیں کنفرم ہیں اور آپ کا تو ویزا بھی نہیں لگا ہوا ہے' کیسے جائیں گے؟" ایجنسی کے مالک نے جواز دیا۔

"ویزا آپ کا مسئلہ نہیں۔ ان ملکوں میں میرے عرب مہمان دوست ہیں۔ اترتے ہی ویزا جاری ہوجائے گا۔ آپ کسی بھی پیسنجر کی سیٹ کینسل کروں۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں' مجھے صرف یہ بتائیں کتنا کیش بھیجوں؟" اس نے دو ٹوک بات کی۔

"سردار صاحب مروا نہ دینا۔" ایجنسی کا مالک نیم رضامندی سے بولا۔

"میں تو دو گھنٹے میں ایئرپورٹ کے لیے نکل رہا ہوں اور پانچ لاکھ آپ کو بھیج رہا ہوں۔ اتنے پیسے لینے کے بعد میرے خیال میں کوئی بھی کام کرنا مشکل نہیں ہوگا۔" اس نے بات ختم کردی۔

"ہو کے سردار صاحب! آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔" پیسوں نے اس کے لہجے کو خوشامدی بنا دیا۔

اس نے جھک کر باپ کے پیروں کو چھوا۔ "جیسے ہی حالات موافق ہوں گے میں لوٹ آؤں گا۔"

"میں بھی کچھ عرصے میں چکر لگاؤں گا۔" وہ پے در پے شکستگی کے احساس سے دوچار ہوئے۔

"فکر نہ کریں بابا! میں باہر رہ کر بھی اپنے دشمنوں کا قلع قمع کرواسکتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر باپ سے بغل گیر ہوا۔

"مجھے پتا ہے تو واقعی سردار ہے۔" وہ بیٹے کی پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے۔

ایئرپورٹ جاتے ہوئے اس نے ایک نمبر پریس کیا۔

"سنو! آج جب وہ دفتر سے نکلے تو دوسرے لمحے دنیا میں موجود نہ ہو۔" اس نے حکم صادر کیا۔

"مومل مرتضیٰ ہمیشہ کے لیے خدا حافظ!" اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔

وہ بھاگ گیا بیرون ملک بینکوں میں کروڑوں ڈالرز کے اکاؤنٹس کے بل بوتے پر وہ ساری زندگی عیش سے گزار سکتا تھا۔ بڑے سردار واپس گوٹھ چلے گئے۔

گوہر کے جانے سے وہ آدھے رہ گئے تھے' مگر اس دن تو جیتے جی مر گئے' جب امریکہ میں دھند کے باعث گوہر کے ایکسیڈنٹ کی خبر آئی۔

شہیار ماں کے بلانے پر انہیں دیکھنے آیا۔ وہ باپ تھے' اسے دیکھ کر کمزور پڑ گئے۔ "گھر واپس چلو اور اپنی جاگیریں سنبھالو۔"

"آپ کی شرائط پر یا اپنی شرائط پر۔"

"تمہاری مرضی' جو جی میں آئے کرنا۔" شیر مردہ ہو چکا تھا۔ اس کی آواز میں نہ وحشت تھی' نہ دھاڑ۔ صرف وحشت ان کی آنکھوں میں ناچ رہی تھی۔ یہ احساس ہی روح فرسا تھا کہ وہ جوان بیٹے کی لاش کو کیسے کاندھا دیں گے۔

شہیار امتحان میں پڑ گیا تھا۔ مائرہ کو ساری صورت حال بتائی تو وہ بکھر گئی۔

"نہیں ہرگز نہیں' نہ تم جاؤ گے نہ میں' وہ ظلم کی فصل کاٹنے' جو تمہارے باپ بھائی نے بوئی ہے۔" وہ یکدم چیخی۔

"میں مجبور ہوں مائرہ! مجھے اپنے باپ سے زیادہ ماں کا خیال ہے۔ میں اس گاؤں کو اب اس حالت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ بابا کو چپ لگ گئی ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہوتے تو میں کبھی نہ جاتا۔" اس نے ناصحانہ انداز اختیار کیا۔

"تو تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔" خوف اس کی آنکھوں سے چھلکا۔ "تم بھی سردار' ظالم وڈیرے بن جاؤ گے' گوہر کی طرح محبت کرنا بھول جاؤ گے اور میں اکیلی رہ جاؤں گی۔" وہ ہذیانی انداز میں بولتے ہوئے غنودگی میں چلی گئی۔

"ہوش میں آؤ مائرہ!" وہ پریشانی سے اسے جھنجھوڑتے بولا۔

سارا علاج' محنت اکارت چلی گئی۔ وہ دورہ جو کافی عرصے سے نہیں پڑا تھا۔ اس کا جانے کا سن کر پھر پڑ گیا۔ وہ ہاتھ کے دباؤ سے اس کے بھنچے ہوئے دانتوں کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

اس دن کے بعد اس نے مائرہ سے کوئی بات نہ کی۔ باپ کو ماں کے ساتھ واپس گاؤں بھجوا دیا۔ جاتے ہوئے ماں کے آنسوؤں سے کی گئی التجا چین سے بیٹھنے نہ دیتی۔

"بیٹا اب لوٹ آنا۔ میں اب تمہاری جدائی نہیں سہہ سکتی۔"

ایک طرف آگ' دوسری طرف پانی' وہ کس سے بچتا' کیا کرتا' دفتر جاتا تو مائرہ کی آنکھوں کی بے یقینی اسے مار دیتی۔

ادھر سادہ دل ماں کے فون پر فون۔

وہ ہر بار مائرہ کی طبیعت کا بہانا کر دیتا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مائرہ کا اعتماد کس طرح بحال کرے۔

ایک دن اس نے مومل کو ٹی وی پر کسی کانفرنس میں شرکت کے بعد تاثرات دیتے دیکھا تو اسے روشنی کی کرن دکھائی دی۔

وہ مومل سے اس دن کے بعد سے نہیں ملا تھا۔ وہ پہلی فرصت میں اس کے پاس پہنچا۔ جب وہ اس کے ساتھ دفتر سے نکلا تو سامنے ڈھاٹا باندھے پستول والے شخص کو ٹھٹکتے دیکھا۔

"شہیار سائیں آپ!" اس شخص کو وہ دن یاد آیا جب دردِ زہ میں مبتلا اس کی بیوی کو شہیار ـــ اپنی گاڑی میں اٹھا کر شہر کے اسپتال لے گیا اور سارا خرچہ خود برداشت کیا۔ بچہ تو ماں کے پیٹ میں ہی مر گیا تھا' مگر بیوی کی جان بچ گئی تھی۔

شہیار نے اسے پہچان لیا۔

"کس کو مارنے آئے تھے۔ مومل کو یا مجھے؟"

"سائیں! آپ کو نہیں۔" اس نے مومل کی طرف

دیکھا۔ "میں حکم کا بندہ ہوں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے آئندہ کبھی ایسی کوشش نہیں کرنا اور گوہر کو بھی پتا نہ چلے کہ ہمیں یہ پتا چل گیا ہے؟"

شہیار نے بعد میں ان دونوں کو گرفتار کروا دیا۔ اور مومل کو گھر تبدیل کر کے آفس چھوڑنا پڑا۔ شہیار نے مائرہ کے بارے میں مومل سے بات کی۔ مومل اور مائرہ کی اب بہت اچھی دوستی ہو گئی تھی۔

"مائرہ! تمہیں شہیار پر اعتماد ہونا چاہیے۔ جسے دولت کی کمی نہ ڈگمگا سکی' اسے فراوانی کیا بگاڑے گی۔" مومل نے مائرہ کو سمجھایا تھا۔

وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

"میں نے مائرہ کو راضی کر لیا ہے۔ اور ہم اپنی این جی او 'روشنی' کے نام سے اس علاقے میں کھولیں گے۔" مومل نے کہا۔

"تو کیا تم راضی ہو؟" حیرت سے استفسار کیا۔

مائرہ مسکرائی۔ "ہاں۔"

"کیا یہ رسک نہیں ہوگا مومل؟" شہیار نے کہا۔

"اگر یہ رسک ہے تو میں لینے کو تیار ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اگر تم اتنے دکھ سہہ کر بھی یہ رسک لینے پر تیار ہو تو میں بھی وہاں چلنے کو تیار ہوں۔ ہم مل کر کام کریں گے۔"

"مگر تم ہمارے معاملات میں ٹانگ نہیں اڑاؤ گے۔" اس نے خوش گوار لہجے میں کہتے شہیار کو وارننگ دی۔

"توبہ توبہ! دو عورتوں کے آگے میری کیا چلے گی۔ میں تو اقلیت میں شمار ہوں گا۔" شہیار ہنسا۔

"دو نہیں تین ووٹ ہیں ہمارے' اماں کو بھول گئے۔" مومل نے ہنس کر کہا۔

"میرے خیال میں پیکنگ کر لینی چاہیے۔ ہم کل ہی جائیں گے۔ اب دیر کرنا بے سود ہے۔" شہیار نے کہا تو مومل اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ٹھیک ہے' میں بھی چلتی ہوں' اب کل ملیں گے۔"

حویلی ان کی منتظر تھی۔ خوشی و غم کی ملی جلی کیفیت میں گھری اماں ان دونوں کو بانہوں میں لے کر بیٹھی تھیں۔ شہیار ان کے قدموں میں بیٹھا تھا۔

"کاش! گوہر تمہیں طلاق نہ دیتا۔" وہ آبدیدہ ہوئیں۔

"اماں کوئی فرق نہیں پڑتا طلاق سے۔ دولت کی ہوس مجھے نہیں رہی' خدمت تو میں تب بھی کرتی تھی اب بھی کرنے آئی ہوں' یہ میرے لیے اپنے لوگ ہیں' ان کی خوشیاں اور غم' دکھ سکھ سب میرے ہیں۔" اس نے دلاسا دیا۔

"چلو بڑے سردار کو دیکھ آئیں۔"

وہ انہیں' اک طرف شہیار' دوسری طرف مائرہ تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے مڑ کر مومل کو دیکھا' جو وہیں رکی ہوئی تھی۔

"پتا نہیں مجھے دیکھ کر وہ کیا محسوس کریں۔" مومل نے دھیرے سے کہا۔

"آج کل وہ کچھ محسوس کرنے سے قاصر ہیں۔" کمرے میں پڑے ہوئے سردار کو دیکھ کر اسے دھچکا لگا تھا۔

کتنا کروفر تھا اس شخص میں۔ جس کا نام سنتے ہی لوگ کانپ اٹھتے تھے۔ جس کو دل ہی دل میں بددعا دیتے بھی خوف زدہ ہو جاتے تھے۔ آج وہ کتنا بے بس تھا۔ کتنا لاچار' دوسروں کے رحم و کرم پر پڑا ہوا ـــ

مومل بے تحاشا رنجیدہ ہوئی۔

"کاش بڑے سائیں! آپ ناانصافی سے گریز کرتے۔" وہ چپ تھی۔ مائرہ ہراساں اور شہیار کی آنکھوں میں نمی آ ٹھہری تھی۔

"جس دن انہوں نے گوہر کے جنازے کو کاندھا دیا' اس دن قبرستان سے آنے کے بعد انہوں نے آنکھ کھول کر دنیا کو نہیں دیکھا ہے۔" گوہر کے ذکر پر اماں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔

"اگر میں تم لوگوں کو نہ بلاتی تو ملکیت پر تمہارا کوئی چچازاد یا ماموں زاد قبضہ کر لیتے اور یہ انا جابرانہ طریقہ

برقرار رکھے بیٹا! اسی لیے میں نے تم لوگوں کو بلایا ہے۔" انہوں نے ماہ رخ کے ہاتھ تھامتے کہا۔ "تم لوگ فکر مند مت ہونا۔ اب سیاہ سفید کے مالک تم لوگ ہو۔"

"اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ شہیار! خدا کرے، تم اس آزمائش میں پورے اترو۔"

"آمین۔" وہ زیر لب بولا۔

جس دن اس نے سرداری کی پگ باندھی۔ اس دن صرف اپنے راج والوں کو بلایا اور اپنے قبیلے والوں کو۔

لوگوں کے دل آس و نراس کا شکار تھے۔ کیا پتا یہ بھی اپنے باپ اور بھائی جیسا نکلے۔ شروع میں تو گوہر علی بھی اچھے تھے، مگر جب سرداری معاملات ہاتھ میں لیے تو اس کے اندر سے سردارانہ سرشت نمودار ہوگئی۔ مختلف چہ میگوئیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

اسٹیج پر اس کے ساتھ پٹواری کو دیکھ کر لوگ حیران تھے۔

"میں امیروں کا سردار نہیں، غریبوں کا سردار ہوں، اس لیے میری پگڑی کے بل امیر نہیں، غریب دیں گے۔" اس اعلان پر ڈرتے ڈرتے بخشو کمہار اٹھا، پھر جمن لوہار، بخشو بڑھئی، آہستہ آہستہ غریبوں نے ہمت پکڑی اور پگڑی کے بل باندھتے گئے۔

یہ پہلی بار ہوا تھا، ایسا کبھی نہیں ہوا، ہمیشہ بڑے بڑے سردار، جاگیردار پگڑی کے بل باندھتے تھے۔

اس نے نجی جیل خانے کے ساتھ جو فارم ہاؤس تھا، وہ مسمار کرا دیا۔ آزادی کے اعلان کے باوجود اس کوٹھ سے کوئی نہیں گیا۔

اس بار جب فصل آئی تو صرف سردار کے گھر نہیں، وہاں رہنے والے لوگوں کے گھروں میں بھی خوش حالی آئی۔

دنوں میں آئی تبدیلی نے پورے گاؤں کو تبدیل کر دیا۔ کوٹھ کی ساری گلیاں پکی ہوگئیں۔ لوگوں کے گھر پکے ہونے لگے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ پرائمری و ہائی اسکول تعمیر ہوگئے۔ پانی کے ہینڈ پمپ ہر گلے میں لگ گئے، جہاں زیر زمین پانی نمکین تھا، وہاں لائن بچھا کر میٹھے پانی کی سہولت پہنچائی گئی تھی۔

شہیار، ماہ رخ اور سوہل کے تکون نے ہر مسئلے کا حل نکالا تھا۔ سر جوڑ کے بیٹھتے اور مسئلہ حل ہو جاتا۔

وہ کسی کو بھی نہیں بھولی تھی۔ ساری لڑکیاں، سارے ساتھی اس کے ساتھ تھے۔ اسکول کی پرنسپل اس کی ماں تھی اور دوسری ٹیچرز کے ساتھ ثمینہ اور شمینہ بھی پرائمری کے بچوں کو پڑھاتی تھیں۔

وہ تینوں جنون عشق کے کم گشتہ کھوجی تھے۔ جس کام کی دھن سوار ہوتی، وہ کر کے رہتے۔ ظلم کی طویل بھیانک کالی رات کے بعد عدل کی روشن چمکیلی صبح نمودار ہو چکی تھی۔ اس لیے کہ تبدیلی لانے والے کرپٹ نہیں تھے اور انہیں اپنے کام سے عشق تھا۔

وہ صبح بہت اجلی، بے داغ تھی۔ جب اس نے اس جگہ گلاب کا پودا لگایا، جہاں عائشہ کے خون نے تبدیلی کی فصل بوئی تھی۔

اس یادگار تختی کی تقریب میں گاؤں کے سارے افراد موجود تھے، کیا عورتیں، کیا مرد، کیا بوڑھے، کیا جوان، بچے سب۔ اور عائشہ کے بیٹے نے جیسے ہی ڈوری کھینچی، تالیوں کی گونج نے ہر آواز کو ختم کر دیا۔ مسکراتے ہونٹ، نم آنکھیں اس کے خون اور بہادری کو سلام پیش کر رہے تھے۔

اس تختی پر کندہ تھا۔

"انقلاب کے راستے میں بہنے والے عائشہ کے خون کو عقیدت و محبت بھرا سلام۔

اللہ اس کو اپنی رحمت کے سائے تلے رکھے جس کی ہمت نے ہم جیسے بے ہمتوں کو بہادر بنا دیا۔"

اس نے نم آنکھوں سے مسکاتے ہونٹوں سے دعا کی اور ماہ رخ اور شہیار نے آمین کہا۔